نئے دور کا معمار

شمس نوید عثمانیؒ

مدیر و مترجم

ڈاکٹر جاوید انجم

نئے دور کا معمار

شمس نوید عثمانیؒ

https://telegram.me/ilmokitab

— مدیر و مترجم —

ڈاکٹر جاوید انجم

27/10/2020

انتساب

○ سیّد عبداللہ طارق اور ان کے ساتھیوں کے نام جنھوں نے ایک 'زندہ وَلی' کے خوابوں کو نئی اُڑان دی۔

○ نئے دور کی اُس 'اعجب الخلق' کی نوجوان ٹولیوں کے نام جن کے لئے دنیا کی امامت کا منصب طے ہے۔

نئے دور کا معمار — شمس نوید عثمانیؒ

مدیر اور مترجم: ڈاکٹر جاوید انجم

ناشر: وَرک چیریٹیبل ٹرسٹ

شمس نوید ہال، وَرک لنک روڈ، رام پور یوپی

ویب سائٹ: www.workglobal.in

ای میل: books@workglobal.in

زرِ تعاون: ۱۰۰ روپے

مطبع: ھمام پبلیکیشنز

۲۰۷۴ دوسری منزل، کوچہ ناہر خاں، چیلان اسٹریٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

موبائل: 9811200621

humampublications@gmail.com

ترتیب مضامین

پیش لفظ۔(چوتھائی صدی کی تاخیر پر معذرت کے ساتھ)	سیّد عبد اللہ طارق	7
سمندر کو کوزے میں بند کرنا ـــ کتنا مشکل کتنا آسان!	ڈاکٹر جاوید انجم	9
ایک تاریخ ساز جس کی اپنی تاریخ گم تھی	سیّد عبد اللہ طارق	19
کچھ یادیں کچھ باتیں	مفتی محمد الیاس قاسمی	43
اک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی	مفتی فضیل الرحمان ہلال عثمانی	50
حیاتِ شمس پر ایک طائرانہ نظر	عمر فاروق عاصمؔ عثمانی	53
رہبر بھی وہ ہمدم بھی وہ غم خوار ہمارے	علی رضا (علیم)	63
بہت یاد آتے ہیں چچا میاں!	مظفر اللہ خاں	67
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہیں نایاب	شجاع الرّحمان شمسی	74
مولانا شمس نوید عثمانی اور ان کی شاعری	عبد الرحمان سیفؔ عثمانی	77
ساتھی...ہر موسم کے	مولیناؒ کے مشن کے کچھ پرانے رفقاء	85
ایک چراغ اور بجھا!! (نظم)	عمر فاروق عاصمؔ عثمانی	106
قلم کے جادوگر ـــ مولانا شمس نوید عثمانی	مدیر	108
وزیر اعظم اندرا گاندھی کے نام ایک خط (انگریزی)	شمس نوید عثمانی	115
عیادتی خط ایک بہن کے نام	شمس نوید عثمانی	116
حرم کے زائر حرم زمیں ہے۔۔۔! (نظم)	شمس نویدؔ	118
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں	مولینا کے سابق طلباء	120
نعتِ رسولِ پاک ﷺ	شمس نویدؔ	132

مادرِ مہربان — چچی جان	شناسا خواتین	133
نذرانۂ خلوص	خدیجہ نوید عثمانی	147
بچوں کے دوست مولانا شمس نوید عثمانی (انٹرویو)	محمود عالم	148
ایسے تھے ہمارے پھوپھا جان	خولہ عثمانی	162
حضرت شمسؔ کا پیغام تحریک کے نوجوانوں کے نام (ایک تصور)	مدثر علی خاں	166

☆☆☆

پیش لفظ

(چوتھائی صدی کی تاخیر پر معذرت کے ساتھ)

لوگ ایک فقیر منش کو سپردِ خاک کرکے آرہے تھے۔ اس کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ہر ایک اس کی کتابِ زندگی میں اپنے تذکرے کا ورق تلاش کرکے دوسروں کو سنا رہا تھا۔ ہر کسی نے کہا کہ آج ایک اللہ والا دنیا سے اٹھ گیا۔ پھر سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ یہ ۲۶ اگست ۱۹۹۳ کی بات ہے۔ اگلے روز کسی اخبار نے کوئی اداریہ نہیں لکھا، کوئی خبر بھی نہیں چھپی۔

اکثر بڑے لوگ اپنی زندگی ہی میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ لیکن کچھ وہ بھی ہوتے ہیں جو اپنی عظمت پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنے دیتے۔ خاک نشین ہی نہیں، ذرہ بن کر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو جانا چاہتے ہیں۔ ایسے بابرکت ذرّات زمین کو ایک نئی حرارت دیتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ نہ صرف نمودار ہوتے ہیں بلکہ نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی فیض رسانی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ تب لوگ رشک کرتے ہیں کہ کاش ہمیں ان کی زندگی میں ان کا ساتھ ملا ہوتا! جنہیں کچھ ساتھ ملا تھا، وہ حسرت سے ہاتھ ملتے ہیں کہ ان کی ایسی قدر کیوں نہیں کی جو ان کا حق تھا۔

اس مجموعہ کے اگلے صفحات میں آپ کو ایک ایسی شخصیت کی زندگی میں جھانکنے کے کچھ دریچے ملیں گے جو رول ماڈل تو نہیں تھی لیکن۔۔۔ لیکن جو کچھ دیر بھی اس کے ساتھ رہا وہ کچھ لے کر واپس ہوا۔

اس نے ایک سنہرے مستقبل کی بنیادیں ہموار کیں تھیں۔ مجھے مکمل یقین ہے کہ وہ دور آئے گا جس کی تعمیر نو اس نے شروع کی تھی۔ اور جب وہ مستقبل حال میں تبدیل ہو گا تو اس کا معمار ماضی سے نکل کر ابھرے گا اور ایک زندہ قوم کے سر کا تاج بنے گا۔

یہ کتاب جب مرتب ہونی چاہیے تھی اس کے چوتھائی صدی بعد آپ کے سامنے آسکی۔ بہت لوگوں نے ارادہ کیا، کوششیں کیں لیکن رب العزت کو یہ اعزاز اسے دینا تھا جو اس کا مستحق تھا۔ ڈاکٹر محمد جاوید انجم بہت خوبیوں کے مالک ہیں۔ ہمیشہ دیانت داری سے اپنے کام میں لگے رہنے والے۔ حلقہ احباب ہمیشہ بہت محدود رہا اور اسی لیے ان کی خوبیوں سے صرف ان کا قریبی حلقہ واقف ہے۔ لیکن اپنی عمر کے اس لیٹ پڑاؤ میں جو تحفہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ رہے ہیں اس کے لیے وہ ان کی ممنون ہوں گی۔ جاوید کو یہ صفحات زندہ و جاوید بنادیں گے۔

سیّد عبد اللہ طارق

۲۵ رمضان ۱۴۴۱ھ

☆☆☆

سمندر کو کوزے میں بند کرنا...
کتنا مُشکل کتنا آسان!

جاوید انجم

گذشتہ کئی برسوں میں مولانا شمس نوید عثمانیؒ کے بیشتر پُرانے اور کچھ نئے ساتھیوں نے مجھ سے اس بات کا ذکر کیا کہ مولانا مرحوم کی شخصیت اور عملی زندگی کے بارے میں ایک ایسی جامع کتاب شائع ہونا چاہئے جو اُن کی زندگی کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کر سکے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ نئی پیڑھی ان کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں سے پوری طرح واقف ہی نہیں ہے اور پُرانے لوگ بھی انھیں بھولتے جا رہے ہیں، حالانکہ اُن کا لگایا ہوا پودھا ماشااللہ آج بھی سر سبز ہے اور ان گنت رنگ برنگے پھول اُن کی دینی بگیا کو مہکا رہے ہیں۔

وقت کی رفتار آہستہ آہستہ مولانا کے پُرانے ساتھیوں کو جوان سے عمر رسیدہ بناتی جا رہی ہے اور کئی لوگ جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں، اس دار فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ مولینا کی اُن کے ساتھ جڑی یادوں کو ہم پوری طرح محفوظ

نہیں کر پائے ہیں اور آنے والے دور میں یہ کام اور بھی دُشوار ہو جائے گا۔
مندرجہ بالا حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے مولانا کے سب سے پُرانے شاگرد ماسٹر علیم صاحب (جن کی داعیانہ کوششیں قابلِ رشک ہیں)، عابد صاحب، فراست علی صاحب، شکیل خاں صاحب، سیّد مسرّت پرویز صاحب، ارشد غنی صاحب اور دیگر حضرات سے تفصیلی گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ اس مشکل ذمہ داری کو راقم الحروف نبھائے اور مضامین و تاثرات کی شکل میں اس کتاب کو شائع کیا جائے تاکہ مولانا کی زندگی اور کردار کے بیشتر پہلوؤں کو محفوظ کیا جاسکے۔ میرے کمزور کندھوں کے لئے یہ حدف بظاہر کٹھن ضرور تھا، لیکن میں محوِ حیرت ہوں کہ بہت سے لوگوں سے رابطہ کرنے کے بعد پتہ چلا کہ اس کام کو آسان کرنے کے لئے اللہ نے تقریباً سبھی کو اپنا علمی تعاون دینے کے لئے پہلے سے ہی تیار کیا ہوا ہے، بس اشارہ کی دیر تھی۔ کئی ایسے بیش قیمت مضامین اور انٹرویو بھی مل گئے جو حضرتؒ کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔ انھیں شکریہ کے ساتھ کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مولانا کے روحانی وارث، ان کی فکر کے ترجمان اور ہم سب کی قیادت کرنے والے سید عبد اللہ طارق جنھیں بجا طور پر 'علامہ' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو میرے بچپن کے ہم مکتب اور دوست بھی ہیں، ان سے جب میں نے تذکرہ کیا تو نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ کئی بیش قیمت مشورے بھی دیئے اور کئی بیرونی حضرات کو فون کرکے اس نیک کام میں علمی تعاون کرنے کی گزارش بھی کی۔ کچھ

مقامی لوگوں سے میں نے مل کر مضمون لکھنے کی درخواست کی جو اپنے محبوب بزرگ کی سنہری یادوں کو آج بھی اپنے ذہن میں سنجوئے ہوئے ہیں۔ ان میں ہر طرح کے افراد ہیں —اساتذہ ہیں، کاروباری ہیں، ان کے اپنے طالب علم ہیں، سرمایہ دار ہیں، غریب ہیں، کسان ہیں، مزدور ہیں، گھریلو خواتین ہیں، الگ الگ دینی جماعتوں سے ہیں، غیر مسلم بھی ہیں۔ ان سب نے عاجزی اور انکساری اور تقوے کے اُس پیکر کو شہر کی سڑکوں پر چلتے پھرتے دیکھا ہے، ان سے باتیں کی ہیں۔ ان کی ہتھیلیوں میں ان کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس کیا ہے۔

میں چونکہ خود ان کا روحانی شاگرد ہوں اور مجھے کہنے دیجئے کہ مولیناؒ بگڑے ہوئے لوگوں کو راہِ مستقیم پر لگانے میں ماہر فن تھے۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں جس نے حقیقی علم، محبّت، سچائی، دیانت، رفاقت، خدمت، وفاداری اور مہمان نوازی جیسے الفاظ کے صحیح معنی انھیں سے سیکھے ہیں۔ میرے اندر آج جو بھی اچھی باتیں ہیں، ان میں حضرتؒ کی ٦ سال کی تربیت کا بھی بہت بڑا رول ہے اور جو کمیاں اور کوتاہیاں ہیں وہ میری اپنی ہیں۔ انھوں نے ہم سب کی سوچ کا کینوس اتنا وسیع کر دیا کہ الحمدللہ مسلکی اور مذہبی تنگ نظریاں، ہمارے تخیّل سے بھی باہر ہیں اور قرآن، حدیث اور حکمت کی روشنی میں مسائل کا حل تلاش کرنے کی ہماری عادت سی بن گئی ہے۔

میری زندگی کا ایک عجیب وغریب واقعہ حضرت مولیناؒ سے جڑا ہوا ہے (اسے

آپ اتفاق بھی سمجھ سکتے ہیں)۔ ہوا یہ کہ تقریبا ١٩٧١ میں جب میں ایک طالب علم اور کمسن عمر کا نوجوان تھا، مولٰینا اور چچی جان پڑوس میں ایک اجتماع میں تشریف لائے اور شاید دونوں نے اپنی تقریر کی۔ میں نے بھی یہ مواعظ حسنہ سنے اور ایک عجیب سی لذت محسوس کی۔ میں وہیں ان سے ملا اور ان کی شخصیت اور باتیں میرے دل میں اتر گئیں۔ پروگرام کے بعد میری دادی صاحبہ نے ان سے درخواست کی کہ وہ ہمارے گھر آکر ناشتہ کرلیں تو انھیں خوشی ہوگی۔ چونکہ حضرتؒ اجتماع میں کسی کے گھر پر بھی کھانا پینا پسند نہیں کرتے تھے، اس لئے حسبِ معمول انھوں نے معذرت کرلی۔ دادی صاحبہ کے بار بار کہنے پر انھوں نے اس شرط کے ساتھ چائے کی دعوت قبول کی کہ اس بچے (میرے) کے لئے آپ انگریزی ترجمہ کا قرآن شریف (جس کا حوالہ بھی ایک پرچہ پر لکھ کر دیا تھا) منگا کر دیں گی۔ دادی نے وعدہ کیا اور اس طرح اس 'مردِ مومن' نے میرے گھرانے پر احسان کیا۔

دادی نے اگلے ہی دن پکتھال کا انگریزی اور اردو ترجمہ مجھ سے ہی منگوا کر اُس پر خاکی رنگ کا جزداں چڑھوا کر اپنے کمرے میں رکھ لیا۔ شاید ہی کبھی اس کا گہرائی سے مطالعہ بھی کیا ہو، مجھے یاد نہیں۔ یادش بخیر! میں ایم اے کرنے کے بعد محکمۂ اعلٰی تعلیم میں لیکچرر ہو گیا اور عرصۂ دراز تک رام پور سے باہر رہا۔ زندگی اندھیروں اور گمراہیوں کی بھینٹ چڑھتی رہی۔ ١٩٧٨ میں نیک سیرت دادی اماں بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔ اس کے تقریباً آٹھ برس کے بعد

جب میں نوکری کی ذمہ داری کے ساتھ اردو ماہنامہ 'ماہ رُخ' کا مدیر بھی تھا تو ایک دن اچانک سید عبد اللہ طارق میرے گھر تشریف لائے اور مولانا کی زیر اشاعت کتاب 'اگر اب بھی نہ جاگے تو' کی اشاعت کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا اور مولانا کے مشن کا بھی تعارف کرایا۔ اس دور میں ہاتھ سے کی گئی کتابت کی کٹنگ پیسٹنگ کر کے کتاب تیار کی جاتی تھی۔ میں اس کام سے خوب واقف تھا، لہٰذا اس خدمت کو انجام دینے کا اعزاز مجھے ملا۔ میں عبد اللہ طارق سے پہلے بھی ملتا رہتا تھا، لیکن اس مرتبہ ایک نیا 'طارق' میرے سامنے تھا۔ بات دل میں گھر کر گئی اور میں ان کے کہنے پر پہلی بار مولانا کے ہفتہ وار درس قرآن کے پروگرام میں جا پہنچا۔

پہلی مرتبہ جانے سے پہلے میری امی نے مجھ سے کہا۔ "بیٹا تم وہاں چچا میاں کے پروگرام میں جا رہے ہو، تمھیں یاد ہے کہ انھوں نے اب سے بہت سالوں پہلے تمہارے لئے ایک انگریزی ترجمہ کا قرآن شریف منگوا کر دیا تھا؟۔ جانے سے قبل تم اس تحفہ کو دیکھنا نہیں چاہو گے ؟" میں حیران اور ششدر تھا۔ کچھ صفحے میں نے پلٹ کر پڑھے اور مجھے پہلی بار ایک انوکھی سی روحانی لذت کا احساس ہوا۔ انھیں خیالات کو سمیٹے ہوئے میں ان تک پہنچ گیا اور پھر انھیں کا ہو کر رہ گیا۔

ایک دن تنہائی میں مولاناؒ سے میں نے اس واقعہ کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے۔ "میں نے شاید تمھیں بہت پہلے ہی مانگ لیا تھا!" لیکن مجھے شدید ندامت کے ساتھ یہ کہنے میں ذرا سی بھی ہچک نہیں کہ ان کے کام کا حق جو مجھ پر واجب تھا، اس کا عشر

عشیر بھی میں ادا نہیں کر پایا۔ اب جب کہ شام ہونے کو ہے تو اشکِ ندامت بھی محرومی کے احساس کو ختم نہیں کر پار ہے ہیں۔ لیکن اللہ رب العزّت کی ذات پاک سے مغفرت کی پوری امید ہے۔

مولانا کی زندگی سے جڑے ہوئے واقعات کے بکھرے موتیوں کو بہت سے قلم کاروں نے اس کتاب میں اپنے مضامین اور تاثرات کے ذریعہ چننے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ کی کچھ سنہری یادوں کا ذکر میں اور کرنا چاہوں گا۔

سری رنگا پٹنم (کرناٹک) میں کچھ اسلامی تنظیموں نے طلبا کے ایک سہ روزہ دینی تربیتی کیمپ کا انعقاد کیا تھا۔ اس میں مولانا شمس صاحب اور عبد اللہ طارق صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس میں مولانا عبد الکریم پاریکھ صاحبؒ جو ایک بڑے عالم اور مولانا علی میاںؒ کے خلیفہ بھی تھے، ان کی خاص شرکت تھی۔ یہ پروگرام ٹیپو سلطانؒ کے مزار سے متصل مسجد میں منعقد کیا گیا تھا۔ حضرتؒ اس مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے رہتے تھے اور دعائیں مانگ کر زار و قطار روتے رہتے تھے۔ لیکن جب مولانا پاریکھ صاحب کا بیان ہونا شروع ہوتا تو شمس صاحب طلبا کے ساتھ پیچھے والی کسی سیٹ پر سر جھکا کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سوال جواب کے سیشن کے دوران مولانا پاریکھ نے شمس صاحب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "ان کی ایک کتاب ہے۔ 'کیا ہم مسلمان ہیں؟' ہم تو مسلمان (صحیح معنوں میں) اسی کتاب کو پڑھ کر ہوئے تھے!" ایک دوسرے موقع پر فرمایا: "ان میں

وہی رنگ ہے جو حضرت مولانا الیاسؒ (بانی تبلیغی جماعت) میں تھا۔"

ایک دن میرے بیٹے عدیل جاوید نے خواب میں رسول اللہ ؐ کی زیارت کی۔ عمر تقریباً ۷، ۸ برس رہی ہوگی۔ صبح بیدار ہونے پر اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی ۔ اجتماع کا دن تھا، لہٰذا میں اسے بھی ساتھ لے کر چلا گیا۔ وہاں حضرتؒ کے ساتھ مولانا سجّاد نعمانی صاحب بھی موجود تھے جن کو میں پہلے سے ہی جانتا تھا۔ اجتماع کے بعد میں نے بچّے کے خواب کا ذکر کیا تو حضرتؒ بے حد خوش ہوئے فوراً بچّے کی آنکھوں کا بوسہ لیا۔ مولانا سجّاد صاحب نے بھی ایسا ہی کیا اور پھر حضرتؒ نے دعائیں دیتے ہوئے فرمایا۔ "یارو! اس گھر پر کیسا اللہ کا کرم ہے!" میری چھوٹی بیٹی صفیہ کا نام بھی حضرتؒ اور مولانا سجاد صاحب سے مشورہ کے بعد ہی رکھا گیا تھا۔

قرآن اور سنّت سے جیسا عملی جُڑاؤ ان کی زندگی میں متعدد بار ہم نے دیکھا، وہ شاید ہماری خوش قسمتی ہی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار سہ روزہ دعوتی تربیتی کیمپ میں جس میں ایک دن سبھی ساتھی روزہ رکھا کرتے تھے، ہم سب لوگ مولٰنا کے ساتھ ایک فارم ہاؤس میں تھے۔ شام کا وقت تھا، اچانک گھنے بادلوں کی ایک زبردست گھٹا آئی اور پورے افق پر چھاگئی۔ تیز ہوا کے ساتھ بجلی بھی گرجنے اور چمکنے لگی۔ ایک پگڈنڈی پر کھڑے ہم کچھ ساتھیوں نے دیکھا کہ کسی انجانے عذاب کے ڈر سے اس مردِ مومن کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا تھا، اور شاید اس موقع پر انھوں نے وہ حدیث بھی سنائی تھی جس میں حضورِ اکرمؐ ایسے موقع پر

افسردہ ہوکر بارش کے عذاب سے بچنے اور اس میں خیر عطا کرنے کی دعا مانگا کرتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد زبردست بارش اور ژالہ باری ہوئی۔ اولوں کا سائز بہت بڑا تھا اور ہم بہت مشکل سے ڈیرے تک پہنچے تھے۔ فصلوں کو بے حد نقصان ہوا تھا. لیکن ہم میں سے کسی کو ذرا بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔

دل کی بیماریوں کے بارے میں فرماتے تھے کہ جو لوگ اللہ کی یاد میں اور انسانیت کے درد کو محسوس کر کے کسرت سے آنسو بہاتے ہیں، انھیں امراضِ قلب ہونے کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے اور جنّت کا ایک نام سنسکرت میں 'رودسی' یعنی رونے والوں کی جگہ بھی ہے۔ اللہ کی یاد اس کی محبت اور اس کے عذاب کے ڈر سے رونے والوں کو دل کی جنّت نصیب ہوتی ہے۔

علاّمہ سید عبداللہ طارق صاحب کے وہ ساتھی جو اُن کے مشن سے خصوصی طور پر وابستہ ہیں، لیکن مولانا شمس نوید عثمانیؒ سے نہ کبھی ان کی ملاقات ہوئی اور نہ ان کو دیکھا، خاص کر نوجوانوں کے حوالے سے اس بات کی امید ہو چلی ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر اُن کے لئے حضرتؒ کی شخصیت کو اپنے اندر ڈھالنے اور خود کو مزید سنوارنے کا کام اور آسان ہو جائے گا۔ ایسی میری امید اور تمنّا ہے۔ میرا یہ حُسنِ ظن ہے مندرجہ ذیل مختصر نکات اس کارِ خیر میں معاون و مددگار ہوں گے:

- حضرتؒ فرماتے تھے کہ اللہ سے نزدیکی بڑھنے کی ایک پہچان یہ ہے کہ بندے کی عبادتوں میں نوافل کی کثرت ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ

نماز میں سر ڈھکنے سے نماز کی فضیلت میں اضافہ ہوتا ہے۔

- حضرتؒ ہر مشکل گھڑی میں خاص طور پر مسجد میں جاکر نماز میں کھو جاتے تھے، ان کے قیام، رکوع اور سجدے قابلِ دید تھے۔ جماعت کا خاص اہتمام کرتے تھے چاہے امام صاحب کسی بھی علمی درجہ کے ہوں۔ مسجدوں میں شوروغل، بے کار کی باتیں کرنا ان کے نزدیک مسجد کی بے حرمتی ہے۔
- حضرتؒ جھوٹ اور رشوت سے کمائی ہوئی روزی کھانے والوں اور وعدہ خلافی کرنے والوں سے سخت بیزاری کا اظہار کیا کرتے تھے۔ غلط بیانی اور چیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا ان کے نزدیک بہت بڑا اخلاقی جُرم تھا۔ دوسروں کی غیبت، کردار کشی اور ان پر کفر و نفاق کے فتوے لگانے کے عمل سے وہ بے حد دل برداشتہ ہوتے تھے۔
- تہجّد کی فضیلت کے بارے میں کہتے تھے کہ تہجد کے وقت جو ہوا چلتی ہے وہ روح کی غذا ہے اور اس سے روح لطف اندوز ہوتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو تہجد میں نہایا وہ دودھ سے نہایا اور جو فجر میں نہایا وہ صرف پانی سے نہایا۔
- حضرتؒ فرماتے تھے: گنہگارو! تم ہی کھڑے ہو جاؤ--- نیکوں (نام نہاد) نے تو لٹیا ڈبو دی، اللہ آپ کے اندر صلاحیت پیدا کر دے گا۔ مداری اپنا کرتب دکھانے کے بعد ہی پیسہ مانگتا ہے اور ایک ہم ہیں کہ اس کی راہ میں کچھ کئے بنا ہی اس سے مانگتے ہیں، ہم سے تو وہ مداری بہتر ہے۔
- ایک اور بات جو کہنی ہے وہ یہ کہ دعوت کا کام اللہ اس سے لیتا ہے جس کا وہ

انتخاب کرتا ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ آپ منتخب ہیں۔ لہٰذ آپ اپنے علم پر گھمنڈ نہ کریں بلکہ شکر ادا کرتے ہوئے لگاتار اس میں اضافہ کرتے رہیں اور روحانیت کو بلند کرتے رہیں۔ بہت سے باصلاحیت لوگ آئے اور چلے گئے، یا ایسے راستوں پر نکل گئے جہاں کام کا اصلی حدف صرف دعوت دین تو نہیں کہا جا سکتا۔

کاش! ہم سب مولانا شمس نوید عثمانیؒ کی شخصیت، کردار، مزاج اور دعوتی حکمت کو اپنی عادتوں کا حصہ بنالیں اور مستقبل قریب کی آزمائشوں سے گزرتے ہوئے آنے والے ان سنہری پلوں کے گواہ بن سکیں جن کے خواب کبھی انھوں نے دیکھے تھے۔ آمین

آخر میں مولانا شمس نوید عثمانیؒ کے دو اشعار کے ساتھ جو مجھے بے حد پسند ہیں، میں اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔

نہ زادِ رہ پہ نظر ہے نہ ہوش منزل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا•
یہ کس نگاہ کا فیضان ہے کہ انساں نے
بھنور کی گود میں دیکھا ہے خواب ساحل کا

• یہ مصرعہ بطورِ تضمین ارشد علی خاں قلقؔ کی ایک غزل سے لیا گیا ہے۔

☆☆☆

ایک تاریخ ساز جس کی اپنی تاریخ گُم تھی۔

(حذف وترمیم واضافہ کے ساتھ ایک پرانی تحریر)

سیّد عبداللہ طارق

ستمبر ۹۳ء کا وسط تھا۔ حضرت مولانا شمس نوید عثمانیؒ کو ہم سے جدا ہوئے بیس روز بھی نہ ہوئے تھے۔ تقاضے آرہے تھے کہ ان کی شخصیت پر میں کچھ تحریر کروں۔ دل و دماغ ابھی تک بلکل معطل تھے۔ تعزیتی خطوط آرہے تھے اور میں پڑھ کر رکھتا جارہا تھا۔ ایک بزرگ بھائی نے لکھا۔ "اگر ایسی عظیم شخصیت امریکہ یا انگلینڈ میں ہوتی تو اعزازات کا انبار لگتا، نوبل پرائز اور دیگر نوازشیں ہوتیں اور وہ قدر دانی ہوتی جو کسی محقق کی نہ ہو سکے۔ انتقال پر یورپ اور امریکہ سوگ مناتے مگر یہاں فروعات پر زور — نمائش ہی نمائش — ایسا شیر مرد ہم سے جدا ہوا مگر ہم اسقدر بے حس بلکہ بے غیرت ہوگئے کہ اخبار میں کسی نے تعزیت تک نہ کی۔ ایسا ہوا جیسے کوئی عام غریب رخصت ہوگیا، گو کہ وہ اس کے محتاج نہیں۔ خیر متاعِ فقیر ساتھ ہی گئی۔"

قلم ہاتھ میں اٹھایا تو خیالات کا ایک لا متناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مرحوم کی زندگی میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ازل سے ان کی معیّت نصیب تھی مگر اب ایسا لگتا ہے کہ وہ چھ برس جیسے چھ لمحوں میں گزر گئے۔ ان لمحوں کی یادوں کے ہجوم سے چند یادداشتیں مستعار لے کر نذر کر رہا ہوں۔

۱۹۷۸ء کی بات ہے ذہن پر بڑی شدت سے دو سوال گزشتہ پانچ سال سے حاوی تھے۔ اس دوران اکثر سوچتا رہتا تھا لیکن جواب نہیں مل پا رہا تھا۔ کسی عالم دین کے پاس ان سوالات کے ساتھ جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا کیونکہ اہل علم ان کے جو جوابات دیتے وہ مجھے اپنے خیال کے مطابق پہلے ہی معلوم تھے۔ نمازیں پابندی سے شروع کر دی تھیں اور مطالعہ قرآن بھی از سر نو شروع ہو گیا تھا۔ مجھے جس روز یہ خیال آیا کہ میرے سوالوں کے جواب مجھے قرآن حکیم ہی سے ملیں گے اس دن رمضان المبارک کی پہلی تاریخ تھی۔ پندرہ سال بعد روزے رکھ رہا تھا، رمضان کا وہ مہینہ یادگار بن گیا۔ سوالات ذہن میں رکھ کر قرآن کا مطالعہ کرتا رہا، کبھی کبھی سارا دن ایک آیت پر غور کرنے میں گزر جاتا، یہاں تک کہ رمضان کی آخری تاریخ آگئی اور میں ابھی سورہ البقرہ کے ۱۸ ویں رکوع سے آگے نہ بڑھ سکا تھا (سوالات ابھی تک باقی تھے۔) یہ بھی عجیب حکمتِ الٰہی تھی کہ میرا مطالعۂ قرآن اس وقت جہاں تک پہنچا تھا اس میں تحویل قبلہ یعنی ماضی کی تبدیلئ قوم کا موضوع تھا اور مشیت ایزدی مجھے اگلے ہی دن مستقبل کی تبدیلئ قوم کی راہ کے کارواں کا مسافر بنانے جا رہی تھی۔

پھر عید کا دن آگیا۔ میں حسبِ معمول بچوں کو ساتھ لے کر اپنے بچپن کے استاد ماسٹر سر فراز صاحب محلہ انگوری باغ، سے عید ملنے پہنچا۔ ماسٹر صاحب کے گھر سے نکلتے ہی پہلی بار یہ خیال دل میں آیا کہ آج چچا میاں سے بھی ملتا چلوں، ان کا گھر وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ حضرت مولانا مرحوم کو بچپن سے جانتا تھا اور چچا میاں کہتا تھا۔ سلام دعا ہوتی رہتی تھی۔ لیکن جوانی میں داخل ہونے کے بعد باقاعدہ ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ گرمیوں کی دوپہر تھی چچا میاں انگوری باغ محلے میں ہی کرائے کے ایک دو کمروں کے بوسیدہ سے بالائی مکان پر رہتے تھے۔ وہ مکان جس پر آنے والے ایک بیرون شہر کے مہمان نے پہلی ملاقات سے پہلے ہی مجھ سے کہا تھا کہ یہ گھر ضرور اللہ والے کا ہے۔ کیونکہ جس کے مکان کے باہری دروازے اتنے ٹوٹے پھوٹے ہوں، اس کے گھر میں چرانے کو کچھ متاعِ دنیا نہ ہوگی۔ میں نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ چچی جان نے دریافت فرمایا "کون؟" میں نے کہا "طارق"۔ آج تک حیرت ہے کہ صرف اس ایک لفظ سے چچی جان کیسے پہچان گئیں۔ کہنے لگیں تمہارے چچا میاں تو لیٹ گئے۔ ٹھہرو، میں اٹھاتی ہوں ۔میں نے کہا، نہیں زحمت نہ دیں، میں پھر کبھی مل لوں گا۔ میں تو ویسے بھی نہ جانے کیوں اُدھر مڑ گیا تھا۔ چچا میاں سے ملنے کی نہ کوئی خاص خواہش تھی اور نہ آئندہ ملنے کا کوئی ارادہ۔ میں مڑا ہی تھا کہ چچا میاں بھاگے چلے آرہے تھے۔ پاجامے پر خالی بنیان پہنے ہوئے بستر سے اٹھ کر تیزی سے بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ ہمیں گھر میں لے گئے۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ برابر کے کمرے سے

چچی جان نے سوئیاں بھیجیں۔ مگر ان چند منٹوں ہی میں نہ مجھے سوئیاں کھانے کا ہوش رہا تھا اور نہ مولانا کو یہ خیال رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کھانے کو کہتے۔ وہ بول رہے تھے اور میں ایک ٹک انہیں دیکھ رہا تھا اور ان کی آواز میرے کانوں میں اتر رہی تھی۔ مولٰنا نے میری یادداشت میں کبھی بھی رسمی گفتگو پر چند جملوں سے زیادہ خرچ نہ کئے۔ وہ ہر ایک سے، جان پہچان والا ہو یا اَن جانا، براہ راست دعوتی گفتگو شروع کر دیتے تھے۔ ایک آتش فشاں سا تھا ان کے سینے میں جو ہر وقت اُبل پڑنے کا منتظر رہتا تھا۔ ہر آن یہی ان کا مزاج تھا، چاہے ملاقات پہلی ہو یا برسوں پرانی۔ مولانا کے منہ سے آہوں بھرے الفاظ ادا ہو رہے تھے اور میں ششدر تھا۔ وہ میرے سوالوں کے جوابات دے رہے تھے۔ ان سوالوں کے جو میں نے ان سے پوچھے نہیں تھے۔ جن کے بارے میں میں سمجھتا تھا کہ اہل علم میری تشفّی نہ کر سکیں گے۔ اور جوابات میری روح کی گہرائیوں میں اترتے جا رہے تھے۔ یہ میری ان سے بچپن کے بعد پہلی ملاقات تھی جس نے مجھ جیسے خود سر کو ان کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ چلتے وقت میں نے مولانا سے کہا تھا "چچا میاں آپ پر کفر کے فتوے لگیں گے، اس کے لئے تیار رہیۓ گا۔"

جب تک کسی مہمان کی خواہش نہ ہو مولانا کبھی اپنے ساتھیوں سے تخلیہ کے لئے نہیں کہتے تھے لیکن مجھے نہ جانے کیوں یہ شرف بخشا کہ خصوصی وقت دیا جس میں اپنے پرانے شاگردوں کو شریک ہونے سے منع فرمادیا۔ میں ان ۲۱ دنوں کی روداد کی تفصیلات اس تحریر میں حذف کر رہا ہوں کیونکہ بہر حال ۶ سال کے

ہر لمحے کی تفصیلات نقل کرنا ممکن بھی نہیں۔

مولانا کی تربیت کا انداز عجیب تھا۔ کبھی براہِ راست کسی سے نہ نماز پڑھنے کو کہتے تھے اور نہ داڑھی رکھنے کو لیکن چند ملاقاتوں میں ہی ملاقاتی کی دنیا بدل جاتی تھی۔ ایک واقعہ سے شاید اس کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ نمازیں میں پابندی سے پڑھنے لگا تھا لیکن صبح کی نماز ہمیشہ قضا ہوتی تھی۔ کالج کے زمانے سے ہی عادت تھی دیر سے سونے اور دیر سے سو کر اٹھنے کی۔ مولانا کبھی میرے گھر صبح کے وقت نہیں آئے تھے اور میرا نہ جانے کیوں آج تک خیال ہے کہ وہ میری اس عادت سے واقف نہیں تھے۔ ایک روز فرمایا "میرا دل چاہتا ہے کہ اجتماعی مطالعۂ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جائے اور وہ تمہارے گھر پر ہو۔ کل صبح میں بھی فجر کے بعد آؤں گا اور دوسرے ساتھیوں سے بھی کہہ دینا۔" میرے ہوش اُڑ گئے۔ ایک دو روز کی بات ہوتی تو ٹھیک لیکن روزانہ صبح کیسے اٹھ سکوں گا؟ بہر حال میں نے کہا، 'بہتر'۔ رات میں الارم لگانے کے علاوہ بھی کئی لوگوں سے صبح جگانے کی تاکید کر دی۔ اب فجر کی نماز باجماعت پڑھنا میری مجبوری تھی۔ ایک دن تو بہت خفّت ہوئی۔ میں سوتا رہ گیا۔ آنکھ کھلی تو سورج نکل آیا تھا۔ بدحواسی میں وضو کر کے دو رکعتیں بڑی عجلت میں پڑھیں اور ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔ یا خدا! آج شاید سب لوگ باہر سے لوٹ گئے ہوں گے۔ دیکھا تو ڈرائنگ روم میں سب موجود تھے۔ کسی نے ان کو بٹھا دیا تھا۔ میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ لیکن نہ مولانا نے ایسا کوئی تاثر دیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے اور نہ کسی اور بھائی نے

نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ آخر سب تھے تو انھیں ہاتھوں کے تربیت یافتہ۔ درس بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔ اس دن کے بعد سے میری یہ حالت تھی کہ رات میں دو تین مرتبہ آنکھ کھلتی تھی کہ فجر نہ ہو گئی ہو۔

درس کا سلسلہ تقریباً تین ماہ چلا اور پھر مولانا نے معذرت کرلی اور باوجود سب کے اصرار کے، کبھی دوبارہ درس شروع نہیں کیا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ صرف ان چند مہینوں کے لئے مولیناؒ نے اشراق و چاشت کے اپنے معمول کو موٴخر کیا تھا ورنہ وہ فجر کے بعد چاشت پڑھ کر ہی گھر آتے تھے اور ناشتہ میں چچی جان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔
ان کا مسجد سے شغف کا حال عجیب تھا۔ جب چچی جان کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو مسجد پہنچ جاتے۔ جب کوئی آکر کسی دعا کے لئے کہتا تو 'صلاۃ الحاجۃ' کے لئے مسجد روانہ ہو جاتے۔ روز نہ جانے کتنے لوگ دعا کرانے آتے تھے۔ جب مجھے اس کا اندازہ ہوا تو میں نے سختی سے اس کی پابندی شروع کر دی کہ ان سے اپنے کسی معاملے کی دعا کے لئے نہ کہتا تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کے باوجود وہ اپنے ہر رکن کی حاجت کے لئے علیحدہ علیحدہ دو رکعت نماز حاجت روز پڑھتے تھے۔ جو ان سے واقف تھے وہ مغرب سے عشاء کے درمیان مولانا کے پاس جانے سے احتراز کرتے تھے کیونکہ اگر کوئی ملاقاتی یا مہمان نہ ہوتا تو ان کا یہ وقت لگاتار مسجد ہی میں گزرتا تھا۔ ہر دو رکعت کے سلام کے بعد فوراً کھڑے ہو کر پھر نیت بندھ جاتی تھی، یہاں تک کہ عشاء کی اذان ہو جاتی۔ میرے علم کی حد تک ان کی صلوٰۃ التسبیح تا زندگی کبھی ناغہ نہ ہوئی اور وہ تہجد، اشراق، چاشت اور

اوّابین کا دوام کے ساتھ اہتمام کرتے تھے۔ ہر نماز کی کیفیت کیا ہوتی تھی، یہ بیان سے باہر ہے۔ اسے دیکھنے والوں نے دیکھا ہے، محسوس کیا ہے لیکن بیان شاید کوئی نہیں کر سکتا۔

مولانا کی اتباعِ سنت اور جذبۂ عمل قابلِ رشک تھے۔ ایک مرتبہ میرے گھر تشریف لائے۔ حسب معمول سلام کے بعد بیٹھتے ہی بغیر تمہید کے شروع ہو گئے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔۔۔" مکمل حدیث سنانے کے بعد بولے "میں نے یاد کر لی ہے تم بھی یاد کر لو۔" پھر دوہرایا، مجھ سے سنا اور اٹھ کر سلام کر کے چلے گئے۔ چچی جان نے بتایا کہ ایک بار گھر میں آئے اور بتایا کہ حضورؐ کا وہ واقعہ سن کر آیا ہوں کہ آپؐ نے ایک محنت کش کے کالے ہاتھوں کو چوم لیا تھا۔ ذرا دیر بعد گھر سے نکل گئے اور جلدی ہی واپس آ گئے۔ چہرہ معصوم بچوں جیسی مسرت سے کھلا ہوا تھا۔ کہنے لگے اللہ کا شکر ہے عمل کر آیا۔ معلوم ہوا کہ کسی محنت کش کی تلاش میں نکلے تھے کہ نالی صاف کرتا ہوا جمعدار نظر آ گیا۔ اسے حضورؐ کا واقعہ سنایا، اس کے ہاتھوں کو چوما اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر کر لوٹ آئے۔ بس اسٹینڈ پر ایک غیر مسلم بنچ پر بیٹھے مونگ پھلی کھا رہے تھے کہ ایک چھلا ہوا دانہ زمین پر گر گیا۔ مولانا بھاگ کر پہنچے۔ دانہ اٹھا کر ان سے کہا کہ میرے حضورؐ گری ہوئی چیز کو اٹھا کر کھا لیتے تھے، آپ کی اجازت ہو تو میں کھا لوں؟ ان صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جب انھوں نے دیکھا کہ مولانا اس دانے کو کھاتے ہوئے ایسی لذّت کا احساس کر

رہے تھے گویا جنّت کا میوہ ہو۔

ریلوے پلیٹ فارم پر ہم سب ٹرین کے انتظار میں کھڑے تھے۔ایک صاحب جن سے کوئی واقفیت نہ تھی، سلام کرتے ہوئے گزر گئے۔ مولانا نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ کہااور جو گفتگو ہو رہی تھی اس میں دوبارہ محو ہو گئے۔ چند منٹ بعد چونک کر مڑے اور غیر معمولی تیزی سے تقریباً دوڑتے ہوئے پلیٹ فارم پر ایک طرف چل دیئے۔ ہم حیران تھے کہ کیاہوا۔ کافی دور مولانا ان صاحب کے پاس پہنچے جو سلام کرتے ہوئے گزرے تھے۔ ان سے مصافحہ کیااور نہ جانے کیا کہاکہ ان کے آس پاس کھڑے لوگوں کے منھ بھی حیرت سے کھل گئے۔ مولانا بے نیاز، مڑ کر ہماری طرف آ رہے تھے۔

"اگر اب بھی نہ جاگے تو— !" کے ڈیڑھ صفحات میں میں نے مولانا کا بہت مختصر تعارف لکھا تھا۔ ماہنامہ افکار ملیؔ، نئی دہلی میں ایک ناقد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھاکہ "ایس عبداللہ طارق صاحب نے ان کی تعریف میں انھیں سوزِ دل ،تعلق باللہ، تدبر و تفقہ میں تمام بزرگانِ دین اور علماء ہند سے اونچا اٹھا دیا۔" حضرت ناقد کی مولانا سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی ورنہ رامپور میں رہنے والے مولانا کے مخالفین بھی جو ان سے واقف تھے آج بھی اگر اسے پڑھیں تو اس کی قسم کھانے کو تیار ہو سکتے ہیں کہ میرے ایک حرف میں بھی مبالغہ نہ تھا۔ راقم الحروف تو ربّ کائنات کی قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہے کہ ان ڈیڑھ صفحات کے وہ

تعارفی الفاظ مولانا کی سیرت کا عشر عشیر بھی نہ تھے۔ حیرت ہے کہ میری ان چند الفاظ میں کھینچی گئی تصویر کو انھوں نے تمام بزرگانِ دین کی سیرت سے بلند تر سمجھا تو قدرے تفصیلی حالات کے خاکے کو کیا کہیں گے! مجھے احساس ہے کہ ناقدین ہی کیا، وہ مخلصین بھی یقین نہ کریں گے جنھوں نے مولانا کو قریب سے نہیں دیکھا۔ مجھے یقیناً ان سے محبت تھی، عقیدت ہے، لیکن اللہ جانتا ہے کہ میری اُس تحریر کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ معصوم عن الخطاء صرف انبیاء ہوتے ہیں، اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن میں ان کی شریک حیات کے بعد ان سے قریب ترین ہونے کے باوجود ان کی کسی اخلاقی خطا سے واقف نہیں ہو سکا۔ ان کی خطاؤں سے صرف ان کا رب واقف تھا (اگر کچھ لوگ جانتے ہوں گے تو وہ اس کا تذکرہ نہیں کرتے) اور خود تو وہ اپنے محاسن کو حتی الامکان چھپاتے تھے۔ کوئی بھی شخص اپنی خوبیوں یا عیبوں کی بدولت ہی جانا جاتا ہے۔ اگر اس مردِ حق کا دنیا نے اصلی روپ نہ دیکھا تو کیا تعجب؟ اپنی زندگی میں بھی وہ اپنی شہرت سے اتنے ہی بے نیاز تھے جتنے اب موت کے بعد۔ لیکن اب جب کہ میں یہ الفاظ تحریر کر رہا ہوں تو یہ نہ صرف ان کا حق ہے کہ میں ان کی سیرت کو پردہ راز میں نہ رہنے دوں بلکہ داعیانِ دین اور آئندہ آنے والی نسلوں کی تقویت کیلئے بھی یہ ضروری ہے تا کہ وہ جان سکیں کہ دین پر عمل کرنے والے صرف قرونِ اولیٰ کے روایتی کردار نہ تھے بلکہ اِس تاریک دور میں گوشت پوست کے نہ جانے مولانا جیسے اور کتنے اللہ کے بندے ایسے ہوں گے جو اگر گوشہ گمنامی میں نہ رہیں تو روشنی کے مینار ثابت ہوں۔

خطا کا تذکرہ آگیا تو مرحوم کی کچھ کمزوریاں مجھے یاد آہی گئیں۔ایک کمزوری ان میں یہ تھی کہ ضرورت سے زیادہ نرم دل انسان تھے، ذرا ذرا سی بات پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ایک دوسری کمزوری یہ تھی کہ مستقل مزاج نہ تھے۔ اتنی جلدی اپنے موقف سے رجوع کر لیتے تھے کہ بعض اوقات ان سے عقیدت کے باوجود ہماری اَنا کو سخت ناگواری محسوس ہوتی تھی اور اس پر طرّہ یہ کہ ایسے بعض مواقع پر ان کا رویہ ہمارے لئے سرد مہری کا ہو جاتا تھا۔ ایک ایسے ہی شاذ موقع پر مجھ سے بڑے خشک لہجہ میں کہا "مجھے برے لگنے لگتے ہو تم جب میں اللہ اور رسولؐ کے خوف سے اپنے کسی موقف سے رجوع کرتا ہوں اور تم اس میں رکاوٹ بنتے ہو"۔ اس دن میں کانپ گیا تھا۔

ایک اور عملی کمزوری یہ تھی کہ وہ پریکٹکل انسان تو بالکل نہ تھے۔حج کے لئے پاسپورٹ کی درخواست دے رکھی تھی۔انٹیلیجنس ڈپارٹمنٹ سے پولس کے دو افراد انکوائری کے لئے آئے۔ ذرا سی گفتگو میں اندازہ ہو گیا کہ یہاں سے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ بالآخر ایک پولس مین نے ان سے کہا، "سنا ہے کہ آپ نے پستکیں بھی لکھی ہیں۔ایک پُستک دے دیجئے۔" مولانا! اور کسی کو کتاب دینے سے انکار کر دیتے؟ وہ بھی غیر مسلموں کو؟ ناممکن!! لیکن اس دن شاید زندگی میں پہلی بار انھوں نے کسی سے یہ کہا کہ پُستک ۲۰ روپیہ کی ہے۔۲۰ روپے دو تو پُستک مل سکتی ہے۔اس وقت کتاب دینا بھی مولانا کی نظر میں رشوت تھی۔ انجام جو ہونا تھا ہوا۔ مولانا اس سال حج کو نہ جاسکے۔

ایک بہت بڑی کمزوری ان کی انتہائی درجہ کی سادہ لوحی تھی۔ ہمیشہ نیچی نگاہیں رکھنے والے سادہ لوح نے گلی، کوچوں اور بازاروں میں کندھوں سے اونچائی کی دنیا گویا دیکھی ہی نہ تھی۔ اپنے محلہ میں کسی لڑکے کو ایک لڑکی سے کچھ اشارہ کرتے ہوئے ایک مرتبہ نظر پڑگئی۔ مولانا کی زندگی میں تہلکہ مچ گیا۔ تقریباً ایک ماہ تک بڑے کرب کے عالم میں ہم سے بار بار کہتے تھے کہ اس محلے میں فاحشات بڑھ گئی ہیں، کسی اور جگہ گھر ڈھونڈ دو۔ ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ حضرت آج کل ہر طرف یہی منظر ہے اور کوئی محلہ اس سے پاک نہیں ہے۔ آپ نے تو بہت معمولی بات دیکھی ہے۔ کیا دیواروں پر پوسٹر لگے ہوئے نہیں دیکھتے کہ کیا ماحول ہے؟ حضرت کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پوسٹر جس اونچائی تک راستے میں لگتے ہیں وہاں تک ان کی نگاہ جاتی ہی نہ تھی۔ انھوں نے برسوں سے کوئی فلمی پوسٹر نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ان سطور کو رقم کرتے ہوئے بھی یہ احساس ہے کہ قارئین کے لئے یہ ناقابلِ یقین ہو گا۔

مولانا کا توکّل بھی حقیقت سے زیادہ افسانوی محسوس ہو گا۔ دو واقعات درج کر رہا ہوں۔

صبح کی ٹرین سے مولٰینا کو باہر جانا تھا۔ صبح کے وقت ان کے علاقہ میں رکشا دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پیش کش کی کہ میں کار لے کر گھر پہنچ جاؤں گا۔ دعا دینے کے ساتھ حضرت نے قبول فرمالیا۔ معلوم نہیں کہ میں انشاءاللہ کہنا بھول گیا تھا یا اس لئے کہ اس واقعے میں میرے لئے نصیحت کا سامان تھا، صبح کو

گیراج کھول کر اگنیشن میں چابی لگائی تو گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی۔ جتنی ترکیبیں مجھے یاد تھیں سب آزمالیں لیکن انجن ٹس سے مس نہ ہوا۔ اِدھر دھکا لگانے والے تھک کر عاجز آ گئے، اُدھر ٹرین کا وقت ہو رہا تھا۔ کار رات تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اور میں نے خود گیراج میں کھڑی کی تھی۔ بہر حال میں نے جلدی سے موٹر سائیکل سنبھالی کہ کم از کم کار کی خرابی کی اطلاع تو کر دوں۔ گھر پہنچا تو مولٰینا کسی رکشا سے اسٹیشن کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ میں نے اسٹیشن کی جانب بائک دوڑائی کہ کم از کم معذرت تو کر لوں۔ ٹرین ابھی نہیں آئی تھی۔ حضرتؒ پلیٹ فارم پر تھے۔ مجھے دیکھ کر شکایت کرنے کے بجائے مسکرائے۔ میں نے ماجرا سنایا تو بہت خوش ہوئے۔ بولے "میں تو رکشا پر بیٹھتے ہی راستے بھر اللہ کا شکر ادا کرتا رہا۔ میری اصلاح کی وجہ سے اللہ نے تمہیں روک دیا۔ جب تم نے کار لانے کو کہا تو ایک لمحے کے لئے میں اللہ پر بھروسے سے غافل ہو گیا اور میرے نفس نے غالب آ کر کہا کہ اب آرام سے اسٹیشن پہنچ جاؤ گے۔ میں نے اللہ کے بجائے تم پر اور تمہاری کار پر بھروسہ کر لیا تھا لیکن اللہ نے مجھے بچا لیا اور تمھارا بھروسہ توڑ دیا۔" وہ خوش اور مطمئن تھے لیکن میرے دل پر بڑا بوجھ تھا۔ پہلی مرتبہ انہوں نے مجھ سے کوئی ذاتی مدد قبول کی تھی (آئندہ آخری وقت تک کبھی کوئی معمولی سے معمولی تقاضہ بھی نہیں کیا)۔ وہ ٹرین سے روانہ ہو گئے تو میں بجھے دل سے گھر واپس آیا۔ نہ جانے کیا سوچ کر بائک کھڑی کر کے پھر کار کا گیٹ کھولا۔ اگنیشن میں کنجی لگائی۔ کار فوراً اسٹارٹ ہو گئی۔ اس میں کوئی خرابی نہیں تھی۔

بھائی منظور فاخر کی زبانی سنایا ہوا دوسرا واقعہ نقل کر رہا ہوں۔ منظور صاحب مارگ دیپ رسالے کے ایڈیٹر تھے، مولینا سر پرست تھے اور انھیں کے مشورے سے رسالے کے سب کام انجام پاتے تھے۔ منظور صاحب نے ایک دن اطلاع دی کہ رسالے کے فنڈ کا آخری روپیہ بھی ختم ہو گیا، اگر مولانا اجازت دیں تو وہ فیاض خاں صاحب (راقم الحروف کے خسر) سے کہیں، امید ہے کہ وہ فوری مطلوبہ رقم مہیا کر دیں گے۔

"تم نے اپنا کام مکمل کر لیا؟" مولینا نے دریافت فرمایا۔

"سارے مضامین تیار ہیں، اب صرف کاغذ خریدنا اور چھپائی میں جانا باقی ہے۔"

"تو اب تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ ہم اپنا کام کر چکے۔ اگر اس کی چھپائی اللہ کی نظر میں مفید ہے تو یہ اللہ کا کام ہے کہ آگے کا انتظام کرے۔"

منظور فاخر صاحب نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن مولینا نے خاموش کر دیا۔ ان کی راضی بہ رضا رہنے کی کیفیت اور ان کا توکل کچھ ایسا ہی تھا۔ ان کو دین کے لیے بھی ماسوا اپنے پروردگار کے، کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارا نہ تھا۔ فاخر صاحب خاموش تو ہو گئے لیکن بے اطمینانی اور عدم اتفاق کے تاثرات ان کے چہرے پر واضح تھے۔ آخر وہ اپنی ذات کے لئے تو کسی سے کچھ مانگنے کو نہیں کہہ رہے تھے! مولانا کی دلیل کی بنیاد بھی یہی تھی لیکن توکل کی بنیاد پر نتیجہ مختلف۔ "آخر ہم اپنی ذات کے لئے تو کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ اب بغیر کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے، آگے کا انتظام نہیں ہوتا تو رسالہ نہ نکلنے ہی میں خیر ہے۔" تھکے تھکے قدموں سے فاخر

صاحب مولانا کے زینے سے نیچے اترے تو ایک صاحب کھڑے کنڈی کھٹکھٹا رہے تھے۔ منظور فاخر صاحب کو دیکھ کر انھوں نے ایک سادہ لفافہ ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا کہ شمس صاحب کو دے دیں اور اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئے۔ منظور صاحب دوبارہ اوپر آئے۔ حضرتؒ حالت نماز میں تھے۔ سلام پھیرا تو منظور صاحب نے لفافہ بڑھایا۔ "کوئی صاحب دے گئے ہیں۔" فرمایا: اسے کھولو۔ لفافہ چاک کیا۔ لفافے میں بعینہٖ اتنی رقم موجود تھی جتنی منظور فاخر صاحب کو مطلوب تھی۔ مولانا مسکرائے، "دیکھو اللہ نے بھیج دیا۔ جاؤ کاغذ خریدو۔" یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لفافہ دے کر آگے بڑھ جانے والا فرشتہ کون تھا۔

گھر کے صحن میں گملے رکھے تھے۔ چند پیڑ گلاب کے تھے۔ پڑوس کے ایک بچہ نے گلاب توڑ لیا تو چچی جان کے منھ سے بے ساختہ "ارے" نکل گیا۔ بچہ سہم گیا اور اپنے گھر چلا گیا۔ مولٰنا گھر پر نہ تھے جب آئے تو چچی جان نے اپنی غلطی بتائی۔ حضرتؒ فوراً باہر آئے۔ کچھ مٹھائی خریدی اور بچہ کے گھر پہنچے۔ بچے کو بلا کر بہت پیار کیا اور مٹھائی دے کر واپس لوٹے۔

کتنی ہی سخت گرمی ہو، مولانا بجلی کا پنکھا آن کئے بغیر خالی بنیان پہنے کتابوں پر جھکے رہتے تھے۔ جب کوئی ملنے آتا تو پنکھا چلاتے۔ اکثر ایک وقت کھانا کھاتے۔ کھانا انتہائی سادہ ہوتا تھا، البتہ مہمانوں کے لئے پر تکلف اہتمام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ چچی جان دیوبند گئی ہوئی تھیں، مولٰنا اکیلے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔

میں پہنچا تو دیکھا کہ گلاس میں پانی ہے اور روٹی کے سوکھے ٹکڑے جو چٹ چٹ کی آواز سے ٹوٹ رہے تھے، گلاس میں ڈبو ڈبو کر کھا رہے ہیں۔ میں نے کہا "یہ کیا؟ آپ میرے گھر کیوں نہیں آگئے؟" بغیر کسی تصنع کے خوش دلی سے فرمایا "یہ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے اور بے حد لذیذ ہے۔ لو تم بھی کھاؤ۔" ان کی فرمائش پر دل کڑا کر کے میں نے ایک ٹکڑا توڑ تو لیا لیکن میرا ایمان ایسا مضبوط نہ تھا کہ مجھے وہ لذیذ لگتا! میری آنکھوں میں یہ دیکھ کر آنسو آگئے کہ حضرت واقعی بہت خوش ہو کر کھا رہے تھے۔

ہم چند لوگ حضرت مولینا کے ساتھ جا رہے تھے، راستے میں ایک صاحب بہ اصرار اپنے گھر لے گئے اور کھانا پیش کر دیا، کھانے کے بعد حضرتؒ نے ہم سے کہا کہ "میزبان کے لئے دعا کرو۔" پھر پوچھا جانتے ہو کیوں؟ ہم خاموش رہے "صاحب خانہ کو دعا دو کہ انھوں نے کتنی عزّت سے تمھیں کھلایا، ورنہ یہ رزق ہمارے لئے مقدور تھا، ہمیں بھیک مانگ کر بھی یہی کھانا پڑتا۔"

حضرتؒ بہت کثرت سے ہمیں یاد دہانی کراتے رہتے تھے کہ جو تمھارے ساتھ کوئی احسان کرے اس کے لئے دعا کرنا کبھی نہ بھولو۔ جو بندوں کا احسان فراموش ہوتا ہے، وہ مالک کا بھی احسان فراموش ہو سکتا ہے۔

ان کی مجلس میں اگر بجلی چلی جاتی تو وہ پنکھا ہاتھ میں اٹھا کر سب سے پہلے تھوڑی دیر خود سب کو جھلتے، اس کے بعد ہی کسی کو پنکھا ہاتھ میں لینے دیتے۔ رات میں

اگر بتی گل ہو جاتی تو اناللہ۔۔۔ کہتے ہی ہمیشہ یہ فقرہ بولتے، "ایک دن ہماری زندگی کا چراغ بھی یوں ہی گل ہو جائے گا۔" بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اور تقریر کرتے وقت اگر بچے موجود ہوں تو ان کے معیار کا لحاظ رکھتے تھے۔ میرے بچے سالار کو اپنا دوست کہتے تھے۔

معمولی فقہی سوالات کے بھی کسی کو جواب نہ دیتے تھے، ہمیشہ کسی دوسرے کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ قضائے عمری کا کیا طریقہ ہے؟ میں قریب میں بیٹھا تھا۔ کہا، یہ سوال طارق سے پوچھ لیجئے۔ مجھے جو معلوم تھا، جب وہ انھیں بتا چکا تو مسکرا کر کہا کہ اصل قضائے عمری تو یہ ہے کہ اب عمر بھر قضا نہ ہونے دینے کا ارادہ کرلیں۔

مولینا شمس نوید عثمانیؒ روئے زمین کی ہر مخلوق سے محبت کرتے تھے۔ لیکن اپنے مشن کے رفقاء سے ان کی محبت وارفتگی کو پہنچی ہوئی تھی۔ اتنی لمبی رفاقت میں ایسے مواقع بھی آئے جب ہم میں سے کوئی روٹھ گیا۔ ایسے موقعوں پر شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ روٹھنے والے کو پہلے حضرت کے پاس آنا پڑا ہو۔ وہ خود ناراض دوست کے پاس پہنچ جایا کرتے۔ ہم لوگوں کو وہ اپنا دوست کہتے تھے۔

حضرت مولیناؒ کا رویہ ہمارے ساتھ بڑے بھائی کا، دوست کا تھا۔ کبھی کبھی تو برابری تک پسند کرتے تھے۔ مشیخیت ان میں نام کو نہ تھی، ایک مرتبہ ہمارے ایک نئے ساتھی کی جو پہلی مرتبہ ہمارے ساتھ بذریعہ سائیکل غیر مسلموں میں

تبلیغی سفر پر نکلے تھے، واپسی پر تکان سے کافی طبیعت خراب ہوگئی۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ ہم اتفاقیہ عشاء کے قریب مولٰینا کے گھر پہنچے تو جناب لیٹے ہوئے حضرتؒ سے بدن دبوا رہے تھے اور حضرتؒ اپنی تراویح موٴخر کر کے خادم کی طرح لگے ہوئے تھے۔ ہمارے پہنچنے پر انھیں چھٹی ملی۔

نفرت کا لفظ ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہیں تھی کہ کسی مخالف کی مخالفت کا تذکرہ ان کے سامنے کریں۔ ہم نے جب کبھی کوئی تذکرہ کیا تو سختی سے روک دیا اور استغفار کرنے کی تاکید کی۔ جو شخص جتنی مخالفت کرتا اس کے لئے اتنی ہی کثرت سے دعائے خیر کرتے تھے۔ بعض اوقات تو ہمیں مخالفین پر رشک آنے لگتا تھا۔ ان کے مخالفین میں جو ذرا بھی واقف تھے، انھوں نے دیانت داری سے ہمیشہ تنقیدی کلمات کہتے یا لکھتے وقت مولانا کی نیکی و اخلاص کی تعریف ضرور کی۔ اس میں صرف ایک استثنٰی ہے۔ ایک معترض جو انھیں خوب جانتے تھے اور مولانا پر زبانی یا تحریری تنقید والزامات کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، انہوں نے ایک تحریر میں مولانا کے لئے انتہائی ناشائستہ الفاظ استعمال کئے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے ان کو ایک صفحے کی ایک تحریر لکھ بھیجی۔ مولانا کو جیسے ہی معلوم ہوا، فوراً ان کے گھر پہنچے۔ کیا گفتگو ہوئی، یہ میرے کبھی علم میں نہیں آیا لیکن مولٰینا کا اس موقع پر ان کے گھر جانا ہم سب کو ناگوار گزرا تھا۔ وہ صاحب بہ کثرت مولانا کے پاس نظر آتے اور جس وقت وہ تشریف فرما ہوتے تو مولانا ہمیں لفٹ نہیں دیتے تھے۔ انداز

سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہماری موجودگی غیر ضروری سمجھ رہے ہیں، حالانکہ کبھی انھوں نے ہم سے یہ کہا نہیں۔

معترض صاحب سے مولینا ایسے پیش آتے تھے گویا خود ان کے مرید ہوں۔ ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سنتے اور لغویات پر بھی سر ہلاتے جاتے تھے۔ حضرتؒ کے اس رویہ پر ہم جل بھن کر کباب ہو جایا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ان کے اٹھ کر جانے کے بعد میری زبان سے ان کے لئے کوئی سخت بات نکل گئی۔ حضرتؒ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھ سے فرمایا "ابھی اسی وقت ان کے پاس جا کر ان سے معافی مانگو۔" اگر حضرتؒ کے تحکمانہ لہجے میں سختی نہ ہوتی تو شاید میں ٹال ہی جاتا لیکن مجھے ان کے گھر جانا پڑا۔ معافی مانگ کر واپس حضرتؒ کے پاس لوٹا تو پیار سے میرا ماتھا چوما۔ مجھے یقین ہے کہ میرے جانے اور واپس آنے کے درمیان وہ صلوٰۃ استغفار میں رہے تھے اور میرے لئے رب کریم سے معافی طلب کرتے رہے تھے۔

ان کے ایک دیرینہ مخالف (جو کبھی ان کے ساتھ رہ چکے تھے) نے ایک مرتبہ مجھے بتایا "میں نے ماس صاب (ماسٹر صاحب۔ مولانا کو اکثر لوگ یہی کہتے تھے) کے یہاں کھانے کو کبھی نا نہیں کی۔" مجھے بہت حیرت ہوئی۔ ہم تو بھوکے ہوتے ہوئے بھی معذرت کر لیا کرتے تھے تاکہ ان پر بار نہ ہو۔ وجہ معلوم کرنے پر انھوں نے بتایا کہ ماسٹر صاحب جیسی حلال کمائی کا رزق کہیں میسر نہیں۔ جتنا پیٹ میں پہنچ جائے غنیمت ہے۔ رہا ماسٹر صاحب کی تنگدستی کا خیال تو مجھے یقین

ہے کہ اللہ انھیں کبھی بھوکا نہیں رکھے گا۔" ان کی بات میرے دل کو لگ گئی اور میں نے بھی اس کے بعد حضرتؒ کے گھر کا کھانا پینا نہ چھوڑا۔

مولینا کا کتابوں کا ذخیرہ عام معیار سے اچھا کلکشن کہا جا سکتا ہے، پھر بھی کہیں کوئی کتاب نظر آتی جسے خرید نہ سکتے تو اس کو پورا پورا کاپی پر نقل کرلاتے تھے۔ تحریر انتہائی باریک تھی اور ورق کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لکھتے تھے تاکہ کاغذ کا ضیاع نہ ہو۔

حضرتؒ کی ایک منفرد عادت تھی۔ راستہ چلتے کوئی بھی کاپی یا کتاب یا رڈی کا پھٹا ہوا کاغذ بھی نظر آجاتا تو اسے لے کر گھر آتے اور پہلی فرصت میں اسے جوڑ جوڑ کر پڑھتے۔ کہتے تھے کہ اللہ نے اس وقت اس کاغذ کے پرزے کے ذریعہ مجھے کوئی پیغام بھیجا ہوگا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اس سے کوئی نہ کوئی کام کی یا نصیحت کی بات نکال لیتے تھے۔

عیادت کا بہت سخت اہتمام کرتے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ کسی کی طبیعت کی ناسازی ان کے علم میں آئی ہو اور وہ عیادت کو نہ پہنچے ہوں۔ روزانہ ہی ایک لسٹ ان کے پاس تیار رہتی تھی۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی کہ اتنا وقت وہ کیسے نکالتے تھے۔ ان کے وقت میں واقعی غیر معمولی برکت تھی۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ بیمار کی عیادت سے عبادت میں کیفیات پیدا ہوتی ہیں کیونکہ بیمار کے سرہانے خدا خود بیٹھا ہوتا ہے۔ کبھی میرے پاس آتے اور اگر دیکھتے کہ مصروف ہوں تو

فوراًواپس لوٹ جاتے ورنہ کہتے کہ ذرا فلاں صاحب کے گھر تک چلو، بیمار ہیں۔ ان کی عیادت کر کے مجھے واپس بھیج دیتے اور پھر کسی اور ساتھی کو اس کے گھر سے پکڑ کر کسی اور مریض کے گھر پہنچ جاتے۔ اس طرح وہ ہماری عبادت میں کیفیات بھی پیدا کرنا چاہتے تھے اور ہمیں اجر میں شریک کرنا بھی۔

اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ قبرستان جانے کا بڑا اہتمام کرتے تھے اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ ایک مرتبہ دیوبند میں میں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کچھ بزرگوں کی قبور پر ایصالِ ثواب کے لیے جاؤں۔ فرمایا "میں گھر چل رہا ہوں۔ فارغ ہو کر آ جانا۔" خود ہمیشہ اکیلے ہی جاتے تھے۔

مجھ سے ملنے آتے تو گھر کے کسی ملازم سے مصافحہ کئے اور خیریت پوچھے بغیر واپس نہ ہوتے۔ ہم سے کہتے تھے کہ تمہاری اصلاح کا حال تمھاری بیویوں، تمھارے گھر والوں اور تمھارے پڑوسیوں سے پوچھوں گا۔ اگر گواہی دیں گے کہ اصلاح ہو رہی ہے تو مانوں گا ورنہ نہیں۔

خوابوں کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اور خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کا حیرت انگیز ملکہ تھا۔ جب ہم اکٹھا ہوتے تو اکثر دریافت فرماتے کہ کیا آج کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ کبھی کبھی تو صرف یہ پوچھنے کے لئے میرے گھر تشریف لاتے کہ کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟ ایک مرتبہ ہمارے تحریکی دوست بھائی محمد حسن مرحوم نے خواب میں حضورؐ کی لحد مبارک کو دیکھا۔ برابر میں بی بی فاطمہؓ کی قبر

دیکھی۔ خواب میں ان پر غلبہ ہوا کہ وہ قبر کو سجدہ کریں۔ جھک رہے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ دریافت فرمایا کہ جھکے تو نہیں تھے؟ کہا، "نہیں بس شروع ہی کیا تھا، پھر آنکھ کھل گئی۔" فرمایا "استغفار کرو، یہ خواب شیطان کی طرف سے تھا۔ اگر توبہ کرلوگے تو چند روز کے اندر ہی حضورؐ کی سچی زیارت ہوگی اور ہو سکتا ہے آج ہی رات ہو۔" اسی روز رات کو محمد حسن کو نبی کریم ﷺ کی زیارت ہوئی۔ ہم سے اکثر خوابوں پر توبہ کراتے تھے۔ فرماتے تھے "الحمد للہ مجھ سے خواب میں کبھی گناہ سرزد نہیں ہوا۔"

مولانا ہم سب سے اتنی محبت کرتے تھے کہ سبھی یہ سمجھتے کہ ان سے خصوصی معاملہ ہے۔ اکثر وہ لوگ بھی جو رام پور سے باہر رہتے تھے اور مولانا سے ان کی ملاقات بہت زیادہ نہیں رہی، وہ بھی یہی سمجھتے تھے۔ گونڈے میں رہنے والی ملک صفیہ بہن سے بھی بے پناہ محبت کرتے تھے جن کا برسوں صاحبِ فراش رہ کر انتقال ہوا۔ ان کی محبت کی فہرست میں ایسے بھی بہت سے لوگ تھے جن سے وہ کبھی نہیں ملے۔

ایک صاحب جن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی (حضرت جلال الدین عمریؒ) ان سے خط و کتابت رہی تھی۔ بڑی کثرت سے ان کا تذکرہ کرتے اور انھیں اپنا استاد بتاتے تھے۔ ہمیں اکثر تاکید کرتے تھے کہ "میرے استاد جلاالدین عمریؒ کے لئے دعائے مغفرت کیا کرو، مجھ میں غیر مسلموں میں کام کرنے کا داعیہ

انھیں کے خطوط سے پیدا ہوا۔" ان کے خطوط کی بہت سی باتیں بڑی عقیدت سے سنایا کرتے تھے۔ اپنے چچا مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانیؒ کے لئے بھی دعا کرواتے تھے جن سے مولانا شمس نوید عثمانیؒ بیعت تھے۔

بڑھاپے میں چچی جان سے ان کی جاں نثارانہ محبت کی مثال نوجوان جوڑوں میں بھی بہ مشکل ملے گی۔ بے تکلف ہر ایک کے سامنے اس کا تذکرہ کرتے کہ مجھے اپنی بیوی سے بہت محبت ہے۔ ہم لوگوں کے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہ تھی اور چچی جان کی علالت میں ان کی خدمت میں لگے رہتے تھے۔ جب بھی کسی سے ملتے تو چچی جان کے لئے دعا کو کہنا نہیں بھولتے تھے۔ فرماتے تھے "اللہ سے عقدِ بندگی کا رشتہ جتنا مضبوط ہوتا ہے، اتنی ہی شریک حیات سے محبت بڑھتی ہے کیونکہ بیوی سے عقد نکاح اللہ کے نام پر ہوا تھا۔"

یہ حضرت مولانا شمس نوید عثمانیؒ سے اپنی ۶ سالہ رفاقت کی بنیاد پر ان کے متعلق میرے تاثرات کا بے حد مختصر خلاصہ ہے۔ بہت سی تفصیلات اور بہت سے واقعات میں نے طوالت کے خوف سے حذف کر دئے ہیں اور کتنی ہی قابلِ ذکر باتیں میرے ذہن سے محو ہو گئی ہوں گی۔ وقت کی تنگی کے باعث موجودہ تذکرے میں مولانا کی فکر، مطالعہ، دعوتِ علم و عمل، غیر مسلمین سے روابط کی تفصیلات، ان پر بہت سے حلقوں کے اشکالات اور مولانا کے ان اشکالات پر ردّ عمل کا ذکر نہیں کر سکا۔ اگر زندگی نے وفا کی تو انشاء اللہ ان کی سیرت کے اس اہم

ترین باب پر آئندہ روشنی ڈالوں گا۔ لیکن موجودہ قسط نامکمل رہے گی اگر میں اپنی اور اپنے رامپور کے تحریکی دوستوں کی ایک چوری کا راز افشا نہ کروں جسے ہم بیرونِ شہر سے آنے والے حضرتؒ کے سبھی معتقدین سے اخفا میں رکھتے رہے تھے۔

مولیٰنا کی انکسارانہ شفقت نے ہمیں ان کی بزرگی کا حقیقی احساس کبھی ہونے ہی نہیں دیا۔ ہم ان کا احترام کرتے تھے، ان سے محبت کرتے تھے، ان سے بے تکلف ہوتے تھے اور جھگڑتے بھی تھے۔ ان سے کبھی اختلاف رائے ہوتا تھا تو ہم کھل کر اظہار کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ ہم سب کی رائے ان کے خلاف ہوگئی اور انھوں نے بربنائے شفقت ہماری بات رکھی اور کبھی کبھی تو ہم میں سے کسی ایک کے معاملے میں ہمارے متشدد ہونے کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ مولانا نے اپنے سامنے ہماری کسی گستاخی کو حتّٰی کہ ہم میں سے بعض کی سگریٹ نوشی کو بھی کبھی سوئے ادب نہیں سمجھا۔ حضرت ہمارے بے تکلف دوست تھے، غمگسار تھے۔ وہ ہم سب کے باپ تھے۔ وہ بہت روتے تھے اور ہمیں بہت رلاتے تھے۔ ہم ان کی موجودگی میں قہقہے لگاتے تھے تو وہ خوش ہو کر زیر لب مسکراتے تھے۔ جب کبھی بیرونِ رامپور کے مہمان آتے تو ہم سنبھل کر باادب بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ مہمانوں کو ہمارا بے تکلفی کا انداز غیر مانوس محسوس ہوگا اور وہ ہمیں گستاخ سمجھیں گے۔ مولیٰنا ہماری ایکٹنگ سے محظوظ ہوتے تھے، انھوں نے ہمارا بھانڈا نہیں پھوڑا۔

قارئین! کیا آپ تقویٰ کی تعریف بیان کرسکتے ہیں؟ مجھ سے اگر پوچھیں تو میں بیان تو شاید نہ کرسکوں لیکن میں نے تقوی دیکھا ضرور ہے۔ تقوے کو زندہ چلتے پھرتے دیکھا ہے۔

ایک دن جب ہم اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے۔ تقوے کا وہ مجسم نمونہ پُر پیچ راہوں کے خاردار کانٹوں سے اپنے دامن کو بچاتا ہوا بہ حفاظت اپنی منزل کو جا پہنچا۔ انھوں نے ہمیشہ ہر قدم پر ہمارا خیال رکھا، ہمیں ساتھ رکھا۔ لیکن دنیا میں ہمارے لئے کامیابی کے راستوں کی نشاندہی کر کے خود آخرت کی کامیابی کی طرف اکیلے دوڑ گئے۔ یہ بھی ان کی کمزوری تھی نا؟

☆☆☆

یہ تحریر ابھی نامکمل ہے۔ مولانا شمس نوید عثمانیؒ کی زندگی کے علمی، وہبی اور روحانی گوشے ان صفحات میں نہیں سماسکے۔ انشاءاللہ کبھی الگ سے یا موجودہ کتاب کی آئندہ اشاعت میں نذر کروں گا۔ (سیّد عبداللہ طارق)

کچھ یادیں کچھ باتیں۔۔۔

مفتی محمدؐ الیاس قاسمی

دارالعلوم دیوبند میں ہماری طالب علمی کا آغاز ۱۹۶۸ ء میں ہوا۔ دورۂ حدیث شریف کے بعد ۱۹۷۲ء میں دارالافتاء سے فراغت ہوئی۔ اسکے بعد ۱۹۸۰ ء تک شعبۂ دارالافتاء ہی میں نقل فتاویٰ اور معین افتاء کے فرائض انجام دیتا رہا۔

دارالعلوم میں تدریس کیلئے انٹرویو بھی دیا جس میں الحمدللہ کامیاب رہا مگر ۱۹۸۰ء میں اجلاس صد سالہ کے بعد ہونے والے ہنگامی حالات کی بناء پر دارالعلوم میں تدریس کی نوبت نہ آسکی البتہ "جامع مسجد" دیوبند میں جب "وقف دارالعلوم" کا قیام عمل میں آیا تو اسی کامیابی کی بنیاد پر ہمیں وقف دارالعلوم میں اسباق دئے گئے اور تقریباً ۴ سال تک دوسرے مشاغل کے ساتھ بلا تنخواہ تدریس کا فرض انجام دیا۔ اسکے بعد آہستہ آہستہ اُس نظام سے اور اُس وقت کے موجودہ اختلافی ماحول سے بیزاری شروع ہوئی اور میں بغیر استعفیٰ دیے عملاً علیحدہ ہوتا گیا۔

شدید ذہنی جھٹکا اُس وقت لگا جب علماء کرام کا مسئلہ اور دارالعلوم کا قضیہ عدالت میں گیا کہ جن علماء کرام کا مقام یہ تھا کہ سارے عالم کے فیصلے وہ کرتے اب خود اُنکا فیصلہ حکومتِ ہند کریگی؟ ایسا محسوس ہوا کہ شاید اِن کا وقت پورا ہو گیا اور مشیتِ ایزدی اب کسی اور سے کام لینا چاہتی ہے، قیادت اِن کے ہاتھوں سے نکلتی جارہی ہے۔

پھر کئی سال اس غور وفکر میں گزرے کہ کس جماعت یا تنظیم سے وابستہ ہو کر دینی کام کیا جائے؟ بہت قریب سے سب کا جائزہ لیتا رہا۔ کہیں فکری کوتاہی نظر آئی تو کہیں عملی بگاڑ۔ قلبی اطمینان کسی جگہ نہیں ہو پارہا تھا۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمۃ کی صحبت و تربیت سے دل و دماغ میں "دعوت الٰی غیر المسلمین" کی اہمیت بیٹھی ہوئی تھی۔ حضرت کی دلی خواہش تھی کہ دعوت کا یہ کام منظم طور پر دارالعلوم کی طرف سے ہو اور چھتہ کی مسجد اُس کا مرکز قرار پائے۔ حضرتؒ نے ایک ذمہ دار شخصیت کا انتخاب بھی اس کام کیلئے فرمالیا تھا۔ دعوت کے اصول اور تفصیلی طریقہ کار پر مشتمل ایک کتاب بھی "دینی دعوت کے قرآنی اصول" کے نام سے تحریر فرمائی تھی جو دارالعلوم کی طرف سے شائع بھی ہوئی مگر بہر کیف، ناقابلِ ذکر وجوہات کی بنا پر حضرت کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور تقریباً نصف صدی سے زائد کا یہ قیمتی عرصہ گزر گیا۔

یہ سب باتیں ہمارے ذہن میں تھیں کہ اسی درمیان معلوم ہوا کہ رامپور میں ایک بزرگوار علامہ شبیرؒ احمد عثمانیؒ کے بھتیجے " شمس نوید عثمانی صاحب " کے نام سے موجود ہیں جن کا برادرانِ وطن میں دعوت کے تعلق سے بڑا گہرا مطالعہ ہے اور اس سلسلے میں تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ بلا تاخیر ہم تین آدمیوں کی جماعت لیکر تین یوم کیلئے رامپور حاضر خدمت ہوئے۔ مولانا سے طویل ملاقاتیں رہیں اور تفصیلی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا۔ دل نے گواہی دی اور قلب کو انشراح ہوا کہ اصل کام تو یہی ہے۔ تمام تر مخالفتوں کے باوجود میں نے برملا اعلان کردیا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ کی رہنمائی میں اِن شاءاللہ کام کیا جائے گا۔ کام کے تفصیلی دلائل اُس وقت تک سامنے نہیں آئے تھے۔ وہ تو بعد میں برادر محترم سید عبداللہ طارق صاحب کے ذریعہ جن کو اب بجاطور پر استاذ محترم کہا جائے، علم میں آئے۔ موصوف مجھ سے تقریباً چھ ماہ قبل مولانا سے تین ماہ کی کلاسیں لے چکے تھے۔ مولانا محترم جب اپنے آبائی وطن دیوبند جاتے تو مستقل انکی رفاقت رہتی۔ اکثر ہماری دوکان "ادارۂ علم و حکمت" میں ہی تشریف فرما ہوتے اور شہر میں چل پھر کر بھی مختلف لوگوں سے اکثر ملاقاتیں رہا کرتیں۔

حضرت مولانا کا انداز گفتگو، طریقۂ دعوت، بڑا عجیب وغریب ہوتا تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ برادرم سید عبداللہ طارق صاحب اس سلسلے میں بہت کچھ تفصیل سے لکھ چکے ہیں مزید کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ داعی کیلئے دو موقعے بہت نازک ہوتے ہیں۔ اُس میں اپنے آپ کو

سنبھالنا اور نفس پر کنٹرول کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اکثر دو باتوں کی خاص طور پر نصیحت فرماتے۔۔

اول یہ کہ دعوتی گفتگو کے دوران اگر بحث و مباحثہ یا مناظرہ کا انداز پیدا ہو جائے تو فوراً گفتگو بند کر دی جائے اور اگلی بات چیت کیلئے مناسب اور نارمل موقعہ کا انتظار کیا جائے۔

دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے کہ اگر کہیں موقعہ پر کسی طرح کی کوئی کامیابی نظر آئے تو سہرا اپنے سَر نہ باندھا جائے بلکہ جو چیز جہاں سے آئی ہے وہیں پہونچائی جائے۔ اس سلسلے میں حضرت مولانا نے خود اپنا ایک واقعہ سنایا۔ علی گڑھ میں ہارنیہ کا آپریشن کرایا تھا۔ وارڈ میں بہت سے مریض ہوتے ہیں، صبح کا وقت تھا مولانا سیب کھا رہے تھے۔ انکی نظر ایک جاروب کش پر پڑگئی جو وارڈ میں صفائی کر رہا تھا۔ حسبِ عادت مولانا نے اس کو بلایا کہ آؤ تم بھی ہمارے ساتھ پھل کھالو۔۔اسکو تردد ہوا۔ اُس نے کہا "میں گندا، میرے ہاتھ گندے، کیسے کھا سکتا ہوں؟" مولانا نے فرمایا "تمہارا ہاتھ ہی تو گندا ہے، منھ صاف ہے، لو میرے ہاتھ سے کھالو!" فرماتے تھے کہ محبت کی زبان ہر ایک سمجھتا ہے، وہ بے چارہ قریب آیا اور مولانا نے اُٹھا کر سیب کا ایک ٹکڑا اُسکے منھ میں دیا۔ آدھا اُسنے کھالیا، بقیہ مولانا کے ہاتھ میں تھا۔ فرماتے تھے کہ تھوڑی دیر کیلئے نفس کو تردد ہوا۔ میں نے اپنے والدین کا بھی جھوٹا کبھی استعمال نہیں کیا جب کہ مسئلہ ہے کہ آدمی کا جھوٹا اگر اُس نے کوئی غلط چیز یا شراب وغیرہ نہیں پی رکھی ہے تو پاک ہے۔ سوچا ہم

اگر داعی ہیں تو شرعی مسئلہ پر عمل کرنا چاہئے۔ فوراً میں نے بچا ہوا ٹکڑا جو میرے ہاتھ میں تھا اُسکے سامنے ہی خود کھالیا۔ معاملہ ختم ہو گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ شام کو یہ منظر دیکھا کہ آٹھ دس آدمی ادب سے ہاتھ جوڑے کھڑے کہہ رہے ہیں کہ آپ بہت مہان آدمی ہیں ہم آپ کے درشن کیلئے آئے ہیں۔ فرماتے تھے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ اتنے میں پیچھے سے ایک شخص بولا کہ یہ میرا بیٹا ہے، اس نے جاکر ہمیں بتایا کہ "آپ نے اس کو آدمی سمجھا!" اب مولانا کا ذہن صبح کے واقعہ کی طرف منتقل ہوا۔ فرماتے تھے، یہی موقعہ داعی کیلئے مشکل ہوتا ہے، وہ خوش ہو کر سہرا اپنے سرباندھنے لگتا ہے۔ مولانا نے اُن لوگوں سے فرمایا، "مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ آدمی کیا ہوتا ہے، مجھ کو کسی نے بتلایا۔ وہ لوگ اور حیرت زدہ ہوئے۔ کہنے لگے وہ کون ہے جو آپ کا بھی گرو ہے۔ مولانا فرماتے تھے کہ اب مجھے دعوت کا موقعہ ملا۔ میں نے حضور اکرم ﷺ کا تعارف کرایا، سیرت اور تعلیمات نبوی کے کچھ نمونے پیش کئے۔ عملی دعوت تو پہلے ہو چکی تھی۔ قولی دعوت اَب سامنے آئی۔ اللہ کا فضل شامل حال ہوا اور الحمدللہ وہ سب مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

یہاں یہ تذکرہ شاید غیر مناسب نہ ہو گا کہ دونوں دارالعلوم کے اساتذہ میں شاید ہی کوئی استاذ بچارہ گیا ہو جس کے پاس میں مولانا کو لے کر نہ گیا ہوں۔ اس وضاحت کے ساتھ کہ یہ حضرت برادرانِ وطن میں خاص طور اور ایک مخصوص نہج کے ساتھ دعوت کا کام کررہے ہیں، ان کا کام اور طریقہ کار ہماری سمجھ میں

آرہا ہے، آپ استاذ ہیں اگر اِن کے کام میں کوئی کمی ہو تو اصلاح فرمادیں اور ابھی بتلادیں ورنہ جب میں کام میں لگ جاؤں گا تو بعد میں آپ کی اصلاح قبول نہیں کروں گا۔ مولانا نے اِس قوم میں دعوت کے سلسلے میں کچھ وضاحت فرمائی۔ سن کر سب نے ماشاءاللہ، جزاک اللہ تو ضرور فرمایا مگر تحریری یا عملی تائید نہیں کی، البتہ استاذ محترم حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمیؒ نے زبانی تائید کے ساتھ حوصلہ افزائی بھی کی اور کاموں کو سراہا مگر تحریری تائید سے وہ بھی قاصر رہے۔ پھر جب سید عبداللہ طارق صاحب نے مولانا کی فکری ترجمانی شروع کی اور اخبار نو دہلی میں "اگر اب بھی نہ جاگے تو!" کے عنوان سے قسط وار مضامین شائع ہونے لگے تو میں نے اساتذۂ دارالعلوم سے خوشامد کی کہ براہ کرم اس کا مطالعہ کیجئے تاکہ تائید حق یا تردید باطل کا فریضہ انجام دے سکیں مگر سب نے یہ کہہ کر مطالعہ سے انکار کردیا کہ "وہ تو عالم نہیں ہیں۔" میں نے عرض کیا عالم نہیں ہیں، اسی لئے تو مطالعہ کی گزارش کی جارہی ہے۔ مگر کسی قیمت پر دیکھنے کو تیار نہیں ہوئے۔ میں نے یہاں تک عرض کیا کہ آپ تائید نہیں کرتے تو تردید ہی میں کچھ لکھ دیجئے تو دارالعلوم کے ایک مؤقر مفتی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اگر میں ان کے خلاف کچھ بھی لکھ دوں گا تو ان کا بھاؤ بڑھ جائے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

بہر حال ۳۰، ۳۵ سال کا یہ طویل عرصہ گزر گیا اور کتاب "اگر اب بھی نہ جاگے تو!" کی طرف اہل علم کی خاطر خواہ توجہ نہ ہو سکی۔ حضرت مولانا کی وفات کے بعد سید عبداللہ طارق صاحب نے نہایت منظم طریقہ پر دعوتی سرگرمیاں جاری

رکھیں جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے ہیں۔ ہمیں حالات کی پرواہ کئے بغیر اپنی صلاحیت کے مطابق اللہ کی رضا کے لیے مکمل اخلاص کے ساتھ اپنا فرض منصبی ادا کرتے رہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تادم آخر اس مبارک کام میں لگائے رکھے آمین!

ہمیں مستقل اور مسلسل دعا بھی کرتے رہنا چاہئے کہ جو لوگ جہاں بھی جس طریقہ پر کلمہ حق کی سربلندی کیلئے کام کررہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو بار آور کرے۔ والسلام خیر ختام۔

☆☆☆

چند احادیث کے مفہوم (شمس نوید عثمانیؒ کے قلب و قلم سے)

(مرحومہ ملک صفیہ بہن کی ڈائری سے)

- وہ حسنِ عمل جو پائدار ہو، وہ چاہے کتنا ہی کم کیوں نہ ہو اللہ کے دل کے لئے سب سے زیادہ پرکشش چیز ہے!
- "جو خدا کو پیارا ہو اس پر پیار آنا اور جو خدا کی نظر میں خار ہو اسکا دل و نظر میں خار بن کر کھٹکنا"، عمل کی اس سے بلند تر کوئی دوسری پرواز ہی نہیں ہے۔
- جس نے ایک بار مجھ (رسولؐ) پر خدا سے رحم و کرم کی درخواست کی، خدا اس پر دس بار رحم و کرم کی نظر ڈالتا ہے۔

ایک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی

مولانا مفتی فیضل الرحمٰن ہلال عثمانی (مرحوم)

جمعرات ۲۲/ اگست ۱۹۹۳ء (۷/ ربیع الاول ۱۴۱۴ھ) شب جمعرات میں بوقت تہجد آخرِ شب (چار ۴/ بجے صبح کے قریب) جناب مولانا شمس نوید عثمانی تقریباً ۶۸ سال کی عمر میں اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر اپنے رب اعلیٰ سے جاملے۔ اناّٰللہِ واناّٰ اِلیہِ راجعُون۔

شمس نوید عثمانیؒ یکے از بانیانِ دار العلوم دیوبند حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے پوتے اور مولانا محبوب الرحمٰن عثمانیؒ کے بیٹے تھے۔ مشہور ادیب اور ناول نگار مسعود جاوید عثمانی صاحب ان کے بڑے بھائی تھے۔ کم سنی میں ہی والد بزرگوار کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ ان کی والدہ صاحبہ بجنور (یوپی) کی رئیس زادی تھیں جن کو ہم لوگ بجنور والی دادی اماں کہا کرتے تھے۔ فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم شمس صاحب نے دیوبند میں حاصل کی پھر اپنے برادر بزرگ مسعود جاوید صاحب کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے اور وہاں گریجویشن کیا۔ انھوں نے اپنی پر مشقت زندگی بڑے صبر وضبط کے ساتھ بسر کی۔ ہمارے دوسرے دادا

صاحبِ نسبت بزرگ مولانا مطلوب الرحمٰن صاحبؒ کی چھوٹی صاحبزادی، مولانا عامر عثمانی مدیر تجلی کی ہمشیرہ خدیجہ خاتون ان کے نکاح میں آئیں۔ تعلیم کے بعد وہ مدرسہ عالیہ رامپور میں انگریزی کے استاد مقرر ہو گئے۔

شمس نوید ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے 'کیا ہم مسلمان ہیں؟' کے عنوان سے صحابہ کرامؓ کی زندگی پر ادیبانہ انداز میں ایک کتاب لکھی ہے جو بڑی مقبول ہوئی۔ لیکن ان کا اصل علمی اور عملی دور وہ ہے جب انھوں نے ویدک دھرم پر تحقیقات کا آغاز کیا اور اس مشکل کام کو اپنا مشن بنالیا۔ ہندو قوم کو اسلام کی دعوت دینے کا طریقہ ان کے نزدیک یہ تھا کہ انھیں یہ سمجھایا جائے اور بتایا جائے کہ تمھارا اصل مذہب جس کی بنیاد ویدوں اور شاستروں پر ہے، اصل میں اسلام تھا۔ وید اور شاستر اپنی اصل صورت میں قرآن سے مختلف تعلیم نہیں دیتے۔ توحید، رسالت، آخرت یہ تینوں بنیادیں ویدوں میں موجود ہیں مگر ان کا مطلب جو سمجھا جارہا ہے وہ نہیں ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ویدوں کو حل کرنے کی کلید قرآن ہے۔ اُن کی تحقیقات کا نچوڑ اُن کی معروف و مقبول کتاب ہے — 'اگر اب بھی نہ جاگے تو!'۔ علمی تحقیق کی حد تک ہی نہیں بلکہ عملی جوش و خروش کے ساتھ وہ اس کام میں لگے رہے۔ ان میں خلوص بھی تھا اور لگن بھی۔

ان کے سینے میں ایک درد مند دل تھا۔ ہر ایک کے ساتھ شفقت اور ہمدردی کا

برتاؤ کرتے تھے۔ بہت سادہ طبیعت تھی، ٹوٹے ہوئے دو رنگ کے چپل پاؤں میں ہوتے اور یہ مرد قلندر نام ونمود سے بیگانہ اپنی دھن میں مست رہتا۔ راقم الحروف سے عمر میں اور ہر اعتبار سے بڑے تھے۔ مگر ایک طرح سے دوستانہ اور برادرانہ رشتہ اس پر غالب تھا جس میں بے تکلفی موجود تھی۔ اس لئے کبھی کبھی بحث مباحثہ کافی بڑھ جاتا تھا۔ ان کی تمنا تھی کہ کوئی قاعدے کا عالمِ دین اس مشن میں ان کے ساتھ ہو۔ ان کی یہ شدّتِ احساس کہ برادرانِ وطن کو دینِ اسلام کی دعوت دی جائے، بجائے خود انتہائی قابلِ قدر ہے۔ نوید صاحب اس عالمِ فانی سے چلے گئے اور اپنے حصے کی کمائی کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ ان کے اس احساس کو عام کرنے کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کرے یہ کام اس ملک میں پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کیا جاسکے۔

ماخوذ : ماہنامہ دارالسلام، نومبر ۱۹۹۳ء

☆☆☆

حیاتِ شمس نوید پر ایک طائرانہ نظر

عمر فاروق عاصم عثمانی (دیوبند)

شمس الرحمٰن نوید عثمانی میرے تائے زاد بھائی تھے۔ عمر میں مجھ سے سال ڈیڑھ سال چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم ساتھ ساتھ ہوئی۔ ہمہ وقت اور تقریباً ہم عمر ہونے کی وجہ سے وہ بھائی سے زیادہ دوست بنے رہے۔

کون نہیں جانتا کہ بچپن سے جوانی تک کے راستے لغزشوں اور کوتاہیوں کے درمیان سے گزرتے ہیں۔ اس عرصہ میں آدمی جیسا بھی ہوتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے، خواہ وہ کسی سے پوشیدہ رہے مگر قریب ترین دوستوں اور ہمہ وقت کے ساتھیوں سے پوشیدہ نہیں رہتا ہے۔ لہٰذا جہاں میری کتابِ زندگی ان کے سامنے کھلی ہوئی تھی وہیں میں ان کے احوال و کوائف سے بخوبی واقف تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے ان کے قدم غلط راستوں پر اٹھتے ہوئے دیکھے ہوں۔ وہ فطرتاً نیک تھے، ذہین تھے اور لکھنے پڑھنے کے شوقین۔ مجھے یاد ہے کہ ہم میں سے اکثر دوست اردو اور فارسی کے مشکل مضامین کو ان سے سمجھا کرتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے، اور کیوں نہ ہوتے جب کہ شاعری ہم سب کو وراثت میں ملی

تھی۔ لہذا غزلیں اور نظمیں خوب کہتے تھے اور ادبی نشستوں کے ساتھ مشاعروں میں پڑھتے تھے۔

کہتے ہم بھی تھے، پڑھتے بھی تھے، مگر ان کی شاعری میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ اصلاحی پہلو ضرور ہوتا تھا اور ان کی یہی بات تمام دوستوں میں ان کو معزز و محترم بنائے ہوئے تھی۔ کبھی کبھی تو ہم انھیں 'صوفی منش' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ مجھے آج بھی اُن کا ایک شعر یاد ہے جو غالباً ۱۹۴۷ یا ۱۹۴۸ میں انہوں نے کہا تھا:

آخرت بیچ کے دنیا کو خریدا ہم نے
اور سمجھے ہیں کہ جاگا ہے مقدر اپنا

وقت بدلا۔ ان کے والد مولوی محبوب الرحمٰن تو پہلے ہی انتقال کر چکے تھے، اس کے بعد والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔ اُس وقت ہم فارسی پڑھ رہے تھے۔ شمس بھائی کے بڑے بھائی مسعود الرحمٰن جاؔوید لکھنؤ کے گورنمنٹ کالج میں انگلش لکچرار تھے۔ وہ بھی والدہ کے انتقال پر دیوبند آئے تھے۔ جب لکھنؤ واپس ہوئے تو شمس بھائی اور ان کی چھوٹی بہن معروفہ خاتون کو اپنے ہمراہ لکھنؤ لے گئے۔

وہاں بھائی مسعود صاحب کے فرمان پر انگریزی پڑھنی شروع کر دی۔ انٹر پاس کر چکے تھے، اس وقت رامپور اسٹیٹ کے اورنٹل کالج (مدرسہ عالیہ) میں جگہ نکلی اور شمس بھائی وہیں ٹیچر ہو گئے۔ ملازمت کے کچھ ہی عرصہ بعد میری چھوٹی بہن

خدیجہ خاتون سے جون ۵۵ء میں شادی ہوگئی۔اس طرح میرے والد مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی شمس بھائی کے چچا تو تھے ہی خسر بھی ہوگئے۔اس شادی کے دوچار ہی ہفتہ کے بعد وہ (میرے والد) پاکستان چلے گئے تھے۔وہ حضرت مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہندؒ کے مرید تھے اور ان کے خلیفہ مجاز بھی۔ان کے ہی اصرار پر شمس بھائی نے بی اے کر لیا۔اس کے بعد وہ خدیجہ کو لے کر کچھ دن کے لئے پاکستان گئے اور والد صاحب سے بیعت بھی ہوگئے۔ اس طرح میرے والد ان کے چچا اور خسر ہونے کے ساتھ ساتھ "شیخ و مرشد" بھی ہوگئے۔لوٹ کر آئے تو نوافل و مستحبات میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔دین کی لگن بڑھ گئی تھی۔ لیکن کبھی اپنے فرض منصبی میں کوتاہی نہیں ہونے دی۔یہ ان کا دین سے پیار تھا کہ انگریزی پڑھی بھی اور پڑھائی بھی، مگر زندگی میں کبھی کوٹ پتلون یا بش شرٹ نہیں پہنا۔

پھر اچانک ایک دن انھیں قرآن کریم پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ انجیل و توریت کا بھی مطالعہ کرنا چاہئے۔ لہذا وہ حاصل کیں اور توریت، انجیل، زبور، تینوں پڑھیں۔ پھر وید اور گیتا وغیرہ بھی حاصل کر لیں اور ان کا مطالعہ بھی شروع کیا۔ سنسکرت نہیں جانتے تھے لہذا اسی دینی لگن کے تحت یہ بھی رامپور میں ہی پڑھی اور جب انھوں نے دوسری کتابوں کو قرآن کریم کی روشنی میں پڑھا تو عجیب و غریب باتیں ان پر منکشف ہونے لگیں۔

میری والدہ (شمس بھائی کی ساس) پاکستان سے آئی ہوئی تھیں۔ وہ ان دنوں رامپور میں تھیں، جب پنشن لی تھی۔ اس پر میری والدہ نے کہا، "بیٹے تم نے پنشن تو لے لی لیکن یہ بھی سوچا کہ آخر اتنی مختصر سی رقم میں تم گزارا کیسے کروگے؟" اس سوال پر مسکرائے۔ اور کہنے لگے اماں جی (وہ میری والدہ کو اماں جی ہی کہتے تھے) جب اباجی نے سرکاری ملازمت چھوڑی تھی تو انھوں نے پنشن بھی نہیں لی تھی (میری والد کو ابا جی کہتے تھے)، تو اُس وقت سے اب تک آپ کو کتنی پریشانی ہوئی؟ والدہ نے کہا اللہ کا شکر، مجھے تو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی! کہنے لگے بھلا اماں جی جب آپ کو پریشانی نہیں ہوئی تو آخر میرا بھی تو خدا وہی ہے جو ابا جی کا ہے، پھر آپ یہ کیوں سوچتی ہیں کہ میرا خدا مجھے تنگی دے گا؟ آخر میں نے بھی تو ابا جی کی ہی طرح دینی کام کرنے کی وجہ سے ملازمت چھوڑی ہے۔ اور پھر میں نے تو پنشن بھی لے لی۔ بہر حال اماں جی آپ پریشان نہ ہوں۔ میرا خدا آپ کو بھی کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دے گا۔ خواہ خواب دکھلا کر کرے یا کسی اور صورت۔ ان کے منھ سے لفظ "خواب" سنتے ہی اماں جی بولیں: ارے مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ میں نے تو رات ہی ایک خواب دیکھا تھا۔ اور پھر اماں جی نے اپنا خواب بیان کیا جو یہ تھا:

آسمان پر زبردست مجمع ہے۔ ہر طرف نورو نکہت کی بارش ہو رہی ہے۔ کچھ دیر میں ایک بہت ہی بڑی سواری آتی ہوئی نظر آئی جس پر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ سواری اور اس کے پیچھے تمام مجمع بڑھتے بڑھتے گھر کی

چھت کے قریب آکر نیچے اترنے لگا۔ میں سوچ رہی تھی کہ یا اللہ! اتنا مجمع اور اتنی بڑی سواری بھلا اس چھوٹے سے گھر میں کس طرح آئے گی؟ اسی وقت ایک آواز آئی، "اللہ اس پر قادر ہے کہ کسی چھوٹی زمین کا رشتہ بڑی زمین سے جوڑدے۔ اسی آواز پر آنکھ کھل گئی۔" یہ خواب سن کر شمس بھائی کا چہرہ کھِل اٹھا۔ بولے، اماں جی کیا اب بھی آپ کو اطمینان نہیں ہوا؟ والدہ صاحبہ نے کہا ہاں میں اب مطمئن ہوں۔ اور پھر والدہ نے کبھی کچھ نہیں پوچھا۔ اور نہ ہی الحمدللہ شمس بھائی کو کبھی کوئی مالی پریشانی ہوئی۔ یہ تھا اس عابد وزاہد کا یقین۔

جب تک شمس بھائی اس تقابلی مطالعہ میں نہیں لگے تھے تو ان کے اصلاحی مضامین اور منظوم کلام مختلف رسائل میں چھپتے رہتے تھے۔ ماہنامہ تجلّی دیوبند میں جو میرے بڑے بھائی مولانا عامر عثمانیؒ نکالتے تھے، شمس بھائی نے "کیا ہم مسلمان ہیں؟" کے عنوان سے مضامین لکھنے شروع کئے۔ یہ سلسلہ بے پناہ مقبول ہوا۔ اسی کی بڑھتی ہوئی شہرت و مقبولیت کی وجہ سے میں نے اسے کتابی شکل میں طبع کرادیا (کیونکہ میں شروع سے آخر تک تجلّی کا منیجر رہا تھا)۔ یہ کتاب بھی بے حد مقبول ہوئی۔ اس مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ اس سوال کا جواب آج کے مسلمانوں کے پاس اشکِ ندامت کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

شمس بھائی سے تمام خاندان کے چھوٹے بڑے محبت کرتے تھے۔ چھوٹے تو چھوٹے، تمام بڑے بھی ان کا احترام کرتے، ان کو اپنے سے بہتر محسوس کرتے

اور ان کی موجودگی میں کوئی بات ایسی نہ کرتے جو ان کے لئے تکلیف دہ ہو۔ حد ہے، عامر بھائیؒ جو اُن سے بہت بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ ایک طرح ان کے مصلح بھی تھے، کیونکہ ان کے اکثر مضامین واشعار پر اصلاح دیتے رہتے تھے۔ وہ بھی ان کا بہت احترام کیا کرتے تھے۔ یہ ان کے پاکیزہ اخلاق اور کردار کی ہی عظمت تھی۔ میں نے کبھی ان کے قول وفعل میں تضاد نہیں دیکھا۔ وہ جو کچھ کہتے اور لکھتے تھے، خود بھی اس پر عمل کرتے تھے۔ عورتوں میں بھی اکثر وعظ کہتے۔ عورتیں اپنا بھائی بنانے میں فخر محسوس کرتیں، اکثر نوجوان چچا میاں کہتے تھے اور ان کے تعلق پر خوشی کا اظہار کرتے۔ بچوں سے بیحد پیار کرتے (خود بے اولاد تھے) بچہ سے سلام کے ساتھ مصافحہ بھی کرتے، مگر بچی سے مصافحہ نہیں کرتے تھے۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "اگر ابھی سے اس بچی کو یہ احساس ہوگیا کہ مردوں سے مصافحہ نہیں کرنا چاہئے تو بڑے ہو کر بھی یہ احساس باقی رہے گا" (کیونکہ شرعاً عورتوں کا مردوں سے مصافحہ منع ہے۔) یہ تھی ان کی دوراندیشی اور اصلاح کا ایک طریقہ۔

شمس بھائی جب بھی دیوبند آتے تو مسلم اور غیر مسلم بھائیوں سے ملاقاتوں میں زیادہ وقت گزرتا، گھر پر کم۔ ایک مرتبہ دیوبند کے ایک مشہور غیر مسلم بھائی جو وید کے علم پر مہارت رکھتے ہیں اور اسی مہارت کی وجہ سے ہر شخص انھیں وید جی ہی کہنے لگا ہے، آئے اور ایک جینی مندر میں تقریر کی دعوت دی۔ کیونکہ یہ وید

جی خود پچھلی ملاقاتوں کی وجہ سے بیحد متاثر ہو چکے تھے۔ دعوت قبول کرلی۔ ہم چھ، سات افراد شمس بھائی کے ساتھ گئے۔ وہاں تقریر کی۔ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ کم و بیش پچاس آدمی ہوں گے۔ واپسی پر ہر شخص نے ان سے مصافحہ کیا۔ ہر ایک احترام میں جھکتا ہوا دیکھا گیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ رامپور منہیاران گئے۔ یہ قصبہ دیوبند سے ۱۵۔۲۰ کلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں ایک ریٹائرڈ کرنل (ان کا نام غالباً بھوپال سنگھ تھا)، رہتے ہیں، ان کے گھر پر نشست ہوئی۔ قصبہ کے بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ جن میں دو چتروید ی تھے جنھوں نے چاروں وید پڑھ رکھے تھے، موجود تھے۔ کرنل صاحب اردو ہندی کم اور انگریزی زیادہ جانتے تھے۔ جب شمس بھائی نے توریت و انجیل اور وید و گیتا کے مضامین کے ساتھ قرآن کریم کے مضامین کا بھی انگریزی میں ترجمہ کر کے بتلایا تو مت پوچھئے کرنل صاحب کا خوشی کے مارے کیا حال تھا۔ کہنے لگے مولانا یہ سب باتیں کتابی شکل میں لائیں اور اُس کتاب کو تینوں زبانوں میں چھپوائیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ جب ہندی ایڈیشن چھپ جائے تو ہمیں بھی بھجوا دیں۔ اس پر کرنل صاحب نے کہا کہ دیکھئے اگر کچھ مالی دشواری ہو تو مجھے ضرور مطلع کر دیں، میں جو کچھ کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔ چلتے ہوئے تمام ہی لوگ سینے سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے مولانا آج آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔

شمس بھائی کی زبان سے کبھی کسی بُرے سے بُرے آدمی کی بھی برائی نہیں

سنی۔ اگر ان کے سامنے کوئی دوسرا بھی اس طرح کی بات کرتا تو کبھی وہ وہاں سے اٹھ جاتے، کبھی کوئی دوسرا موضوع چھیڑ کر پہلی بات کا رُخ بدل دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ مرض کو دور کرنا اچھی بات ہے مگر کسی مرض کی وجہ سے مریض کو ہی ختم کرنا کوئی عقل کی بات نہیں۔ وہ جس کے ساتھ بھی کوئی تعاون کرتے کبھی کسی دوسرے پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔

انھوں نے کبھی کوئی بات ایسی نہیں کہی جو خلافِ واقعہ ہو۔ انتہائی راست گو، صادق القول، ایفائے وعدہ کو پسند کرنے والے، متقی، پرہیز گار، دوستوں کے بہترین دوست، ادیبوں میں بیٹھیں تو بہترین ادیب، شاعروں کے درمیان شاعر اور عالموں کے ساتھ ہوں تو ایک اچھے عالم۔ ہر شخص کے منصب و مرتبہ کا خیال رکھتے ہوئے اس سے بات کرنا اُن کا مزاج بن چکا تھا۔

شعری نشستوں میں صرف ان اشعار پر داد دیتے جن میں کوئی اصلاح یا درسِ عبرت بھی ہو۔ ایک مرتبہ رامپور گیا۔ کہنے لگے بھائی کوئی نئی غزل وغیرہ کہی ہے کیا !میں نے کہا ایک نظم کہی ہے سنیں گے؟ فوراً کہا نہیں۔ ابھی نہیں، میں آج کچھ شاعروں کو بلوالوں گا نشست ہو جائے گی۔ اور اُس وقت آپ کی نظم سنیں گے۔ نشست ہوئی۔ بڑے اچھے اچھے کلام سننے کو ملے۔ جب میرا نمبر آیا تو بھائی شمس نے میرا مختصر سا تعارف کراتے ہوئے نئی نظم کی فرمائش کی۔ نظم پوری تو اس وقت نہ یاد ہے نہ ہی اس وقت ڈائری قریب، البتہ ایک دو دو بند اس کے یاد ہیں، جو لکھے دیتا ہوں:

اک انقلاب آچکا اک انقلاب آئے گا

بجاکہ میرے دیس میں فساد ہی فساد ہیں
بجا کہ دشمنِ وطن ہی آج بامراد ہیں
بجا کہ رہنمائے قوم آج کم سواد ہیں
بجاکہ قول و فعل میں تضاد ہی تضاد ہیں
مگر کتابِ جہل میں خرِد کا باب آئے گا
اک انقلاب آچکا اک انقلاب آئے گا

مسرتوں کی روشنی کبھی نظر تو آئے گی
جو منزلوں سے جاملے وہ رہگزر تو آئے گی
سکونِ دل کے واسطے کوئی خبر تو آئے گی
ہزار شب طویل ہو مگر سحر تو آئے گی
سیاہیوں کو کاٹتا اک آفتاب آئے گا
اک انقلاب آچکا اک انقلاب آئے گا

نظم پر جھوم جھوم گئے، برجستہ کہا انشاء اللہ وہ انقلاب ضرور آئے گا اور جلد آئے گا۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ بھائی یہ نظم مجھے لکھ کر دیدیں، میں اسے اپنی کتاب میں شامل کروں گا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ ان کی فطرت میں ہی نیکی بھری ہوئی تھی۔ میں نے آنے والے جس انقلاب کا ذکر کیا تھا ممکن ہے وہ کچھ اور رہا ہو، مگر انھوں نے اسے اپنے مقصد کے لئے انتخاب کر لیا۔ میرے بعد خود انھوں نے

بھی اپنا کلام خوب خوب سنایا۔ اور سب سے بھرپور داد لی۔

اللہ نے انھیں جو بھی دیا اچھا دیا اور وافر مقدار میں دیا۔ انشاء اللہ پھر کبھی موقع ملا تو ان کی زندگی کے دوسرے گوشوں پر روشنی ڈالوں گا، بہت سارے واقعات یاد آرہے ہیں مگر وقت کی کمی ان کو لکھنے کی اجازت نہیں دیتی۔ لہذا باقی۔ باقی!

(ماخوذ: ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۳ء)

☆☆☆

مولیناؒ کی ایک انتہائی حسین نعت کے الگ الگ جگہ سے دو اشعار جو میری یادداشت میں باقی رہ سکے۔

(سیّد عبد اللہ طارق)

تُو تھا خدا کا حرفِ آخر، مانے کوئی نہ مانے
ہم نہ تجھے پہچانے آقا ہم نہ تجھے پہچانے
غارِ ثور کو اَوجِ یقیں پر اُڑ جانا سکھلایا
جنگِ احد کو گھائل لب سے رازِ دعا سمجھایا

رہبر بھی وہ ہمدم بھی وہ غم خوار ہمارے

علی رضا (علیم)

'چچامیاں' لفظ زبان پر آتے ہی ذہن کے پردے پر ایک نرم و شفیق، درد مند، ہمدرد، فراخ دل، صاحب ادراک اور متقی و پرہیز گار مسلمان کا چہرا اُبھرتا ہے۔

اپنی ضروریات و خواہشات کو لیکر بے نیاز اور قوم و ملت بلکہ تمام عالم انسانیت کو صراطِ مستقیم پر گامزن دیکھنے کی تڑپ رکھنے والے چچامیاں۔ نرم و گداز دل کے مالک، سوتے جاگتے ہر لمحہ اللہ کے ذکر، اللہ کی یاد اور اُس کے خوف سے لرزہ براندام رہنے والے چچامیاں، جن کو لوگ عموماً ان کی حیات میں شمس صاحب اور ماس صاب (ماسٹر صاحب کا رامپوری تلفظ) کہا کرتے تھے لیکن جوں جوں اپنی شخصیت پر خود اُن کے اپنے ڈالے ہوئے پردے اٹھتے جائیں گے آئندہ نسلوں کی گردنیں نہ صرف حضرت مولانا شمس نوید عثانی علیہ الرّحمۃ کے نام پر احتراماً خم ہوں گی بلکہ ان کی ممنون بھی ہوں گی۔

مولیناؒ سے پہلی ملاقات کب ہوئی، یہ بات اہم نہیں۔ اہم تو یہ ہے کہ اللہ رب

العزت کو میرے والدین کی دعاؤں کے طفیل مجھے رُشد وہدایت کے ایک عظیم الشان سلسلے سے منسلک کرنا تھا۔ ایک کامل مرشد، بلند وبالا استاد اور روحانی شخصیت کے زیرِ سایہ تربیت واصلاح کا موقع فراہم کرنا تھا۔ بے شک! والدین کے بعد حضرت مولیٰناؒ میرے لئے اللہ کا سب سے بڑا انعام تھے۔ حضرت مولیٰنا علیہ الرّحمۃ سے میرے کتنے دیرینہ مراسم، کتنی قربت رہی، اس کا بیان درج کرنا میرا مقصد نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ وہ اصلاح وتربیت کا ایک روشن ترین ماہتاب تھے۔ لاتعداد خوش نصیبوں کی طرح میں نے بھی اس ماہِ تاباں کی روشنی سے فیض پایا۔

مولیٰناؒ معلم تھے۔ صرف پیشے سے ہی نہیں، مزاج وعادات اور فطرت سے بھی معلم تھے۔ سوالات کے تسلّی بخش اور شافی جواب دینے کی صفت گویا اُنہی پر ختم تھی۔ انتہائی رقیق القلب تھے۔ عام گفتگو کے دوران بھی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں اور اگر کبھی کوئی دعا کی درخواست کرتا تو سچے موتیوں کی پاکیزہ لڑی آنکھوں سے رخساروں پر پھیل جاتی تھی۔ یہی حال عام خطابات اور تقریر کے دوران ہوتا تھا کہ باربار دل بھر آتا اور مستقل آنسو بہتے۔

میں نے مولیٰنا مرحوم جیسا سنّت کا عامل اپنی زندگی میں کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ صبح سے شام تک کے معمولات ہوں، سماجی مراسم ہوں، اخلاق ہو، گفتگو یا اظہار، اُن کا ہر عمل سنتِ رسولؐ کا پابند تھا۔ احساس کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی گھر

میں کوئی پھل کھایا گیا ہو تو اُس کے چھلکے خود کوڑے کے ڈھیر پر پھینکنے جاتے تھے کہ کہیں اگلی صبح گھر کی صفائی کرنے والی ملازمہ کی نظر اُن پر پڑے اور اسے اپنی محرومی یا مفلسی کا خیال آئے۔

اگرچہ آج اُن سے محبت کرنے والوں کی تعداد بہت ہے، لیکن ایک زمانہ تھا کہ اُن کی مخالفت کرنے والے اور محبت کرنے والے تعداد میں برابر تھے، بلکہ شاید مخالفین زیادہ تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ مخالفین کی زیادہ تر تعداد ان کے حسنِ اخلاق اور تقویٰ سے متاثر ہو کر اپنے ارادوں سے پلٹ گئی اور جو چند ایک گروہ بند مخالفین باقی بھی رہے ان کا وہی حال ہوا جو حق کے رُوبرو باطل کا ہوتا ہے۔ وہ شقی القلب اور انکی مخالفتیں جاءَ الحقّ وزھق الباطِل کے مصداق وقت کے غبار میں گم ہو گئیں۔ مخالفت کا آغاز بلکہ طوفان اُس وقت برپا ہوا جب انکی مایہ ناز تصنیف "اگر اب بھی نہ جاگے تو!" منظرِ عام پر آئی۔ لوگوں نے ان کی تعلیمات و نظریات اور افکار کو سمجھنے کے بجائے الزام تراشیاں شروع کر دیں اور یہی نہیں بلکہ شہر، سماج، حتیٰ کہ آس پڑوس سے اُن کے مخالف پیدا ہو کر ہنگامے کرنے لگے۔ بہت نازک اور صبر آزما مرحلہ تھا لیکن ایسے نازک مرحلے میں بھی وہ مردِ مومن کی طرح مطمئن، پُر سکون اور معتدل تھے۔ لوگ انکی مخالفت میں حدود سے تجاوز کرتے جاتے تھے اور مولیناؒ مستقل مخالفین کی خیر و سلامتی کی دعائیں کرتے تھے۔ نہ صرف دعائیں بلکہ عملی طور پر بھی ان کی خیر خواہی فرماتے تھے۔ کبھی کسی مرحلے پر کسی مخالف کے کسی عمل پر ناراضگی کا اظہار تو دور

کی بات ہے اُنہیں ناگواری کا خیال تک نہ آیا۔

وہ بیک وقت مفکر، دانش ور، عالم باعمل، مردِ مومن، بے مثال مقرر اور یکتائے روز گار معلّم تھے۔ ان کا عمر بھر کا اثاثہ محض دینداری تھا۔ ان کو ہر لمحہ رضائے الٰہی کی فکر تھی، اُن کا ہر عمل قرآن وسنّت کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ بظاہر مطمئن لگتے تھے لیکن باطن میں مستقل تڑپ تھی کہ کسی طرح دینِ حق سے ناآشنا ہم وطنوں تک پیغامِ حق پہنچا دیا جائے۔

اللہ ربّ العزت ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند کرے اور ہم سب کو بالکل انہیں کی طرح مومن بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین آمین۔

☆☆☆

یہ ایک حل ہے۔۔۔! (شمس نوید)

(پیش ہے کعبہ کے خونیں حادثہ ۱۹۷۹ کے بعد لکھی گئی نظم کی آخری سطور)

ہر ایک طائرِ لاہوت کو پکارا ہے
چمن نے سازشِ صیاد و باغباں کے خلاف
ہوئی رکوع و سجود و طواف تک محدود
بہارِ حج جو کبھی تھی ہر اک خزاں کے خلاف
اجارہ داریٔ کعبہ کا حق کسی کو نہیں!!
یہ ایک حل ہے ہر اِک عقدۂ جہاں کے خلاف

بہت یاد آتے ہیں چچا میاں

مظفر اللہ خاں

عجز وانکساری، انسانی ہمدردی، خلوص و محبت اور راہِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو خدا شناسی سے متعارف کرا کر ان کو شیطان کے چنگل سے نکال کر راہِ خدا میں لگا دینے کی ہمہ وقت تڑپ رکھنے والے شخص کا نام شمس نوید عثمانی تھا۔ ہمہ وقت آخرت کا تصور اور تقویٰ کے اصولوں کی پاسداری کرتے رہنا ان کی زندگی کا عمل تھا۔ ۱۹۹۳ء میں وہ اس سرائے فانی کو چھوڑ کر آخرت کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

مولانا شمس نوید عثمانی صاحب دیوبند کے ایک علمی، متقی اور پرہیزگار خاندان کے فرد تھے۔ وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مولانا شبیر عثمانیؒ کے سگے بھتیجے تھے۔ ہندوستان کے دینی اور علمی حلقوں میں اپنے منفرد قلم سے ممتاز مقام حاصل کرنے والے 'تجلی' کے ایڈیٹر مولانا عامر عثمانی صاحب کے وہ سگے چچا زاد بھائی اور بہنوئی تھے۔ بچپن سے میں ان کو چچا میاں کے نام سے جانتا تھا۔ وہ رام پور کے محلہ انگوری باغ میں واقع مسجد تہور خاں کے کرایہ کے مکان میں

رہتے تھے۔ ان کے گھرانے سے میرے گھرانے کا بہت گہرا تعلق تھا۔ بہت بچپن کی بات ہے کہ میں نے شاید ان سے کتاب کے بارے میں کہا تھا۔ ایک دن انہوں نے ایک منّی سی کتاب مجھے تحفے میں دی جس کا عنوان ہی 'منّی کتاب' تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب شعور بیدار ہوا تو محسوس کیا کہ مولانا شمس صاحب کے پاس بیٹھنے سے جو سکون و طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ کہیں نہیں ملتی۔ مولانا شمس نوید عثمانی صاحب رامپور کی مشہور و معروف علمی درسگاہ مدرسہ عالیہ میں استاد تھے۔ اس تعلیمی ادارے میں مسلمانوں کے بڑے اکابرین نے تعلیم حاصل کی ہے۔ وہ مسجد کے کرایہ کے بالائی مکان میں رہتے تھے۔ دو کمروں کے اس مکان میں ایک کمرہ مردانے کے طور پر اور دوسرا زنان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مردانے میں وہ ہر اتوار کو صبح ایک گھنٹے کا درس قرآن دیا کرتے تھے۔ اس درس قرآن میں شریک ہر شخص کا دل ان کی رقت آمیز قرانی تفسیر اور دعاؤں سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا، وہ اس محفل میں خود بھی روتے تھے اور سننے والوں کے دل بھی بھر آتے تھے۔ ان کی بے لوث زندگی نے بہت سے لوگوں کے طرز زندگی کو تبدیل کر دیا اور وہ ان کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

انتقال سے دس سال پہلے مولانا شمس نوید عثمانی صاحب کو یہ احساس ہوا کہ جب مذہبی کتابیں اتحاد کی بہت سی باتیں اپنے اندر رکھتی ہیں تو پھر انسانوں میں آپس میں ایک دوسرے کے لئے نفرت کا جذبہ کیوں موجود ہے؟ انہوں نے ہندوؤں کی مقدس کتابوں وید، اپنشد، پران، اسمرتیاں، رامائن، مہابھارت وغیرہ کا خود

مطالعہ کیا۔ان کی انگریزی بہت اچھی تھی، وہ ان ہندو مقدس کتابوں کے انگریزی اور ہندی ترجمے پڑھ کر اسلام اور ہندو مذہب میں بہت سی مماثلت کی باتیں تلاش کر لیتے تھے۔ وہ غیر مسلم بھائیوں سے کہتے تھے کہ جب وید ایک خدا کو مانتا ہے، خدا کی کسی شبیہ اور مجسمے کا انکار کرتا ہے، تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا؟ وہ ہندو مذہبی کتب کے حوالے دے کر برادران وطن کو اسلام کی حقانیت سے روشناس کراتے تھے۔ گرمی کا موسم، چھت کا مکان، ہندو مذہبی کتابیں چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں اور مولانا شمس نوید عثمانی صاحب تخت پر بیٹھے ہندو مسلم اتحاد کی گمشدہ کڑیاں مذہبی کتابوں میں تلاش کرتے تھے۔ ان کے پاس کئی مفسرین کی تفسیریں اور احادیث کی مستند کتابیں تھیں جن کا انہوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہوا تھا۔

مولینا کے یہاں بدھ کے دن عشاء کی نماز کے بعد مخصوص نشست ہوتی تھی جس میں خاکسار بھی شرکت کرتا تھا۔ ایک گھنٹے کی اس نشست میں مولانا شمس صاحب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مختلف واقعات کو اس انداز سے سناتے تھے کہ وہ ذہن پر نقش ہوتے چلے جاتے تھے۔ پہلے اس ہفتہ واری رات کی خصوصی نشست میں حکیم دولہ خاں، ماسٹر تسخیر صاحب، شاکر بھائی، ماسٹر احمد علی صاحب، تنویر بھائی اور میں شریک ہوتا تھا، بعد میں خاکسار اور تنویر بھائی ہی بدھ کی نشست کے شرکاء ہوتے تھے۔ جب گرمیوں کی سالانہ چھٹی ہوتی تھی تو مولانا شمس صاحب بھی اپنے وطن دیوبند جاتے تھے۔ وہ اپنے گھر کا

سامان صندوق اور برتن وغیرہ میرے غریب خانے پر رکھوادیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ برتنوں سے بھرا بورا میں اور شمس صاحب زینے سے اتار رہے تھے، اسی وقت شمس صاحب نے بہت ہی عجیب انداز میں کہا کہ دیکھو مظفر زندگی کا سامان کتنا جمع کر لیا آخرت کے سامان کی بھی کچھ تیاری ہے؟

ان کے گھر کے نیچے ایک غریب بیوہ انّا بوا رہتی تھیں۔ وہ جب بھی سودا سلف لینے جاتے، انّا بوا سے ضرور دریافت کر لیتے تھے کہ بازار سے کچھ منگانا تو نہیں ہے؟ انّا بوا کے حرج مرض میں وہ ان کی تیمارداری کرتے تھے۔ غیر مسلموں کو دعوت دین ان کی زبان میں دینے کے لئے مولانا شمس عثمانی صاحب نے ہندی میں ایک رسالہ 'مارگ دیپ' نکالا جس میں ان کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان کی حقیقی بھانجی عطیہ صاحبہ کے شوہر منظور فاخر صاحب اس رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ ماہ رمضان کا زمانہ تھا، 'مارگ دیپ' کے ایک خصوصی شمارے کیلئے مولانا شمس نوید عثمانی صاحب کے تحقیقی مضمون کو لکھنا تھا۔ دوپہر میں میں نے ان کے ساتھ کام کیا۔ وہ بولتے گئے اور میں ہندی میں لکھتا رہا۔ پھر یہ طے پایا کہ تراویح کے بعد پھر بیٹھا جائے۔ میں گھر سے اجازت لے کر تراویح کے بعد ان کے پاس گیا۔ وہ مضمون بولتے رہے اور میں لکھتا رہا۔ جب مجھے نیند آنے لگتی تو وہ کہتے تھے کہ وضو کر لو اس سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ وضو کے بعد پھر لکھنے کا کام شروع ہوتا۔ اس طرح سحری تک ان کے خصوصی مضمون کو لکھنے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ وہ عصر کی نماز کے بعد اکثر و بیشتر عیادت کے لئے جاتے تھے۔ کبھی

کبھی مجھے ان کے ساتھ جانے کی سعادت ملی۔ وہ بیمار سے یہ ضرور کہتے تھے کہ آپ میری عیادت قبول کر لیجئے۔ بیمار کے پاس زیادہ بیٹھتے بھی نہیں تھے اور تسلی اور تشفی کے جملے ادا کرتے تھے۔

۱۹۸۷ میں خاکسار دہلی کے ذرائع ابلاغ کے معروف ادارے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن میں صحافت کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ وہاں ۱۹ ستمبر کو مولانا شمس نوید عثمانی صاحب کا لیکچر ہوا جس کو صحافت کی تعلیم حاصل کرنے والے طلباو طالبات نے بہت ہی سنجیدگی اور دلچسپی سے سنا۔ مولانا شمس نوید عثمانی صاحب کے لیکچر کا نچوڑ یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان کے درمیان نفرت کا جو زہر پھیلا ہوا ہے اسے قرآن اور وید کے مشترکہ مطالعہ سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے صحافت کورس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رام جی لال جانگڑ نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ایکتا کی لو کے روپ میں یہ کام شمس نوید عثمانی صاحب نے شروع کیا ہے، امید ہے کہ ان کا مشن تیزی سے پھیلے گا، اس لیکچر سے اس صحافتی ادارے کے اسٹوڈنٹس اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے رامپور آکر مولانا شمس نوید عثمانی صاحب سے دوبارہ ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

طلبا کی ایک ٹیم دو دن کے رامپور دورے پر مولانا سے ملاقات کرنے کے لئے ۸ نومبر ۱۹۸۷ء کو پہنچی۔ اس میں اشوک سنگھ، اسیم کمار، آرایندرا پادھیائے، انامی شرن ببل، تاراچند آریہ، پرمانند آریہ، پارتھیو کمار، مکیش کوشک، بھرت لال

مینا، راس بہاری، رامیشور دیال، شمبھوناتھ سنگھ، ستیندر رنجن، سنیتا اور سویدھا کے علاوہ ہریش کمار بھی تھے۔ اس ٹیم کی سرپرستی انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن نئی دہلی کے استاد رام جی پرساد سنگھ کر رہے تھے۔ دودن کے اس دورے میں صحافت کی تربیت حاصل کرنے والے طلبا و طالبات نے مولانا شمس نوید عثمانی صاحب کی روحانی صحبت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ آج بھی یہ لوگ مولانا شمس نوید عثمانی اور رامپور کے ساتھیوں کو یاد کرتے ہیں۔ اس وقت یہ تمام ہندوستان کے بڑے بڑے اخبارات، نیوزایجنسیوں، ٹی وی اور ریڈیو میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں، لیکن رامپور کے انتہائی مختصر دورے نے ان کے ذہن و قلب پر ایسا نقش کیا ہے کہ جب بھی بات ہوتی ہے تو رامپور کا تذکرہ ضرور آتا ہے۔

مولانا شمس نوید عثمانی صاحب نے بتایا کہ دیوبند میں عامر عثمانی صاحب پر جادو کر دیا گیا تھا جس سے وہ سخت بیمار ہو گئے تھے، اس بیماری میں وہ اپنے یہ اشعار پڑھتے تھے اور روتے تھے:

نہ زہد و تقویٰ نے یاوری کی نہ کام کوئی کمال آیا
حساب کے دن یہ سب عمارت حساب کی ضربتوں نے ڈھادی
مگر یہ کہیئے کہ اپنے دامن میں تھے ندامت کے چند آنسو
انہیں کسی نے قبول کر کے ہماری فردِ عمل جلادی

بہت بچپن کا واقعہ یاد آتا ہے کہ جب عامر عثمانی صاحب رامپور تشریف لاتے

تھے، مولانا شمس صاحب کے مکان کے آنگن میں دری بچھ جاتی تھی اور اسلام پسند شعراء کی ایک نشست ہوتی تھی جس میں ثمر شمسی بھی شرکت کرتے تھے۔

مولانا شمس صاحب نے بتایا کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو بددعا نہیں دی سوائے ایک شخص کے۔

تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمِ۔۔۔ (ہلاک ہو دینار اور درہم کا بندہ)، یہ حدیث ان سے اتنی دفعہ سنی کی ذہن پر نقش ہو گئی۔

چچا میاں کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس نے زندگی کے نشیب و فراز میں ہمیشہ صحیح راہ دکھائی۔ ہندو مسلم اتحاد کا یہ علمبردار ۱۹۹۳ء میں خاموشی کے ساتھ اپنے رب سے جاملا۔

☆☆☆

نقلی خداؤں کے سچے بندے

حضرت مولینا شمس نوید عثمانیؒ فرماتے تھے یہ ہندوستانی لوگ بڑے مذہبی ہیں اور ان کی بڑی تعداد میں بہت روحانیت ہے۔ یہ صبح اس وقت اٹھ کر نہا دھو کر پوجا میں لگتے ہیں جب فجر کی نماز پڑھنے والے ابھی بیدار ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ مصنوعی خداؤں کے سچے بندے جب سچے خدا کو پہچانیں گے تو بہت اعلیٰ درجہ کے مومن ہوں گے۔

(سیّد عبداللہ طارق)

اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہیں نایاب

شجاع الرّحمان شمسی

میرا مولانا شمس نوید عثمانی صاحبؒ سے بہت دیرینہ تعلق تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے نیک لوگ دیکھے ہیں، لیکن تقوے، پرہیز گاری اور انسانوں سے محبت کرنے والی ان جیسی شخصیت میں نے آج تک نہیں دیکھی! ہاں، زبانی دعوے کرنے والے اور علم والے کھوٹے سکے بہت سے ہیں۔ میری بیوی نصرت کو بھی دونوں میاں بیوی اپنی بیٹی کی طرح سمجھتے تھے اور اپنے قیمتی مشوروں اور دعاؤں سے نوازتے تھے۔

میں ایک مرتبہ جب ۱۹۸۴ میں نائیجیریا سے واپس آیا تو میرے ایک قریبی عزیز نے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا جس میں ایک بڑے عالم اور مولٰنا بھی شامل تھے۔ تمام طرح کے کھانے دستر خوان پر تھے۔ مولٰنا کے آگے ایک برتن میں پانی والا مولی کا اچار رکھا تھا، وہ اچار کے پانی کو شوربہ سمجھ کر روٹی سے کھانے لگے اور کسی پر تکلف چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میزبان کے اصرار کے باوجود انھوں نے کھٹے پانی سے اپنی دعوت پوری کی اور اپنے میزبان کا شکریہ

ادا کرتے ہوئے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

کسی کام کو شروع کرنے سے قبل جب کوئی ان سے مشورہ کے لئے جاتا تو اس سے فرماتے تھے کہ کل صبح آنا۔ اس درمیان وہ فجر کی نماز میں امام صاحب جو صورتیں پڑھتے تھے، ان پر غور و فکر کرکے اپنا مشورہ دیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک طرح کا استخارہ (اللہ سے مشورہ) تھا۔ میری اہلیہ نصرت نے جب اسکول کھولنے کا ارادہ کیا تو انھوں نے ایک خواب دیکھا کہ انار کے پیڑ میں بڑے بڑے انار لگے ہیں لیکن کونپلیں تازی اور ہری ہیں۔ اس خواب کو جب ان سے بیان کیا گیا تو کہنے لگے۔ تم اس کام کی بسم اللہ کرو!۔ ان سے مشورہ کرکے دل مطمئن ہو جایا کرتا تھا۔ ہم نے اسکول کھولا اور آج الحمدللہ شہر کے سرکردہ اسکولوں میں ہمارے اسکول کا بھی نام ہے۔ اسکول کی ترقی کے لئے بہت دعائیں دیا کرتے تھے۔ وہ اکثر قرآن سے بھی استخارہ کیا کرتے تھے۔

گرمی کے موسم میں جب ان کے گھر فرج نہیں تھا، وہ ہمارے گھر سے اکثر ٹھنڈا پانی بھروا کر لے جاتے تھے، خاص کر اجتماع کے دن آئے مہمانوں کے لئے۔ کتنی بڑی اعزاز کی بات تھی یہ! نصرت نے بتایا کہ ایک دن مولیٰنا دوپہر میں ٹھنڈا پانی لینے آئے، وہ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد ایک کونے میں کھڑے ہو جاتے تھے تا کہ کسی خاتون کے دروازہ کھولنے پر اچانک سامنا نہ ہو جائے۔ اس دن میں گھر میں اکیلی تھی اور جیسے ہی وہ دروازہ سے پانی لے کر جانے لگے تو

اچانک تیز بارش شروع ہوگئی اور مولیناؒ بارش سے بچنے کے لئے چھجے کی اوٹ میں کھڑے ہوگئے اور میرے کہنے کے باوجود انھوں نے دروازے میں داخل ہونے کے بجائے باہر کھڑے ہوکر بھیگنا پسند کیا اور بارش ہلکی ہونے پر واپس چلے گئے۔ اس لئے کہ حکم الٰہی یہی ہے! اسلام اور شریعت پر عمل کرنے والے ایسے مرد کامل کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔

☆☆☆

گود سے گور تک

۔۔۔اس بے توفی سے جو ہستی خدا کے فضل و کرم سے آدمی کو نکال سکتی ہے، وہ ہے ماں اور صرف ماں۔ وہی ماں جس کے گوشت سے اس کے بچے کا جسم بنا ۔جس کے دودھ سے اس کا خون تیار ہوا، جس کی لوری سے وہ سویا اور جس کی آواز پر اس نے آنکھ کھولی—وہی ماں اس کے دل کی آنکھ کھول سکتی ہے اور بچے کی پوری زندگی میں وہ اسلامی انقلاب لا سکتی ہے—پوری زندگی میں انقلاب—جو گود سے شروع ہوتا ہے اور گور تک جاری رہتا ہے—اور گور سے آگے لامتناہی وقت تک جس کی برکتیں چلتی رہیں گی—جو اگر خدا کے فضل سے صحیح معنوں میں شروع ہو جائے تو پھر کبھی وہ ختم نہیں ہوتا، ہمیشہ برکتوں کے ساتھ جاری رہتا ہے۔۔۔

(شمس نویدؔ)

مولانا شمس نوید عثمانیؒ اور ان کی شاعری

عبدالرحمان سیف عثمانی

"مولانا شمس نوید عثمانی" ایک ایسی شخصیت جن کے نام کا اثر پورا پورا ان کی زندگی پر تھا۔ جس طرح شمس (سورج) کے آنے سے سیاہ رات کی تاریکی اجالے میں بدل جاتی ہے، جس طرح آفتاب کی گرمی پاکر بہت سی چیزیں پگھل جاتی ہیں، اسی طرح مولانا شمس نوید صاحب کی صحبت کے اُجالے سے نہ جانے کتنے دلوں کے اندھیرے دور ہوئے اور ان کی زندگیوں میں حقیقی نور کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ ایسی روشنی جس میں ہر چیز صاف نظر آنے لگتی ہے۔ دنیا میں انسان کی آمد کا مقصد، آخرت کی زندگی کا یقین، جنت کی طلب اور جہنم سے دوری کی خواہش وہ سب جو بے دینی کے اندھیرے میں کبھی نظر نہ آتا تھا، وہ سب جو جہالت کی تاریکی نے ذہن و دل کی گہرائی میں کہیں پنہاں کر دیا تھا۔

مولانا شمس نوید صاحب کے اشکوں میں وہ تاثیر تھی کہ جس کا اثر سخت سے سخت دل کو پگھلا دیتا تھا۔ بھٹکے ہوئے بے دین لوگوں کو دین کی دعوت کے سہارے راہِ راست پر لانے کی تڑپ جس قدر مولانا شمس صاحب میں ہم نے دیکھی ہے ایسی تڑپ اور

لگن گزشتہ صدی میں کسی اور میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ امت کے لیے راتوں کو مصلے پر رونا اور زار و قطار رونا، اس کے لیے دعائیں کرنا یہ وہ نبیوں والی صفت ہے جو مولانا شمس صاحب میں اس قدر موجود تھی کہ ان کی کوئی شب ایسی نہیں گزرتی تھی جس میں وہ امت کو جہنم سے بچانے کی دعائیں نہ کرتے ہوں۔ رات کو اللہ سے رو رو کر غیر مسلموں کے لیے ہدایت کا نور مانگتے تھے اور دن میں انھیں لوگوں کو دین پہنچانے کی فکر میں غرق رہتے تھے۔ ان کا بس چلتا تو ہر آنے جانے والے کو کندھوں سے پکڑ کر اسے دین کی دعوت دے کر ایمان کی دولت سے مالا مال کر دیتے۔

مولانا شمس صاحب کیسے تھے؟ انہوں نے کیا کیا کام کیے؟ ان کا طریقۂ دعوتِ تبلیغ کیسا تھا؟ ان کے حیات کے شب و روز کن امور سے عبارت تھے؟ ان کی زندگی کے حالات، ان کا مقصد، ان کا مشن، ان کے تلامذہ کی کارکردگیاں، ان سب کے بارے میں آپ کو اس کتاب میں کافی مواد مل جائے گا۔ یقیناً درج بالا عناوین پر لوگوں نے اپنے مضامین میں ضرور کلام کیا ہو گا۔ ویسے بھی شمس نوید صاحب کی زندگی کو آپ چند صفحات لکھ کر کسی ایک مضمون میں نہیں سمیٹ سکتے۔ ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں جو ہمارے لیے قابل تحسین بھی ہیں اور قابل تقلید بھی۔

مجھے جناب جاوید انجم صاحب نے جس عنوان پر مضمون لکھنے کا حکم دیا ہے، وہ مولانا شمس نوید صاحب کی شاعری ہے۔ مولانا شمس نوید صاحب کے متعلقین، شاگرد اور پڑھے لکھے ادبی ذوق رکھنے والے سبھی لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ مولانا شمس نوید صاحب تحریر اور تقریر دونوں کے غازی تھے۔ ان کی تقریر ایسی پر سوز اور معنی

خیز ہوا کرتی کہ سامعین منجمد ہو کر ہمہ تن گوش تقریر میں محو رہتے تھے۔ ان کی تقریر سے دل پر ایسا اثر ہوتا تھا کہ کئی دنوں تک بھی اس کی تاثیر زائل نہ ہوتی۔

یہی معاملہ تحریر کا تھا۔ ان کی تحریر کا سوز اور کرب ہر دل کو اپنے حصار میں لے لیتا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا شقی القلب ہو جس کی آنکھیں مولانا کی کتاب ''کیا ہم مسلمان ہیں؟'' کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک بار بھی نم نہ ہوئی ہوں۔

مولانا شمس نوید صاحب نظم اور نثر دونوں پہ یکساں قدرت رکھتے تھے۔ نثر کی طرح نظم میں بھی ان کا اصلاحی پہلو غالب رہتا تھا۔ ان کی غزلیں بھی کمالِ فن کا نمونہ ہیں اور ان کی نظمیں بھی زباں شناسی کا مظہر۔

تحریر و تقریر کی صلاحیت مولانا میں موروثی تھی یعنی خاندان کے دیگر افراد کی طرح ہی تحریر و تقریر کا فن ان کے خون میں شامل تھا۔ مولانا شمس نوید عثمانی کے دادا مولانا فضل الرحمٰن عثمانی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے قیام، نظام و انصرام میں آپ کی حیثیت نمایاں ہے۔ آپ عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مولانا اصغر حسین میاں صاحب نے اپنی کتاب حیات شیخ الہند میں آپ کا ذکر خاقانیٔ ہند کے لقب سے کیا ہے۔ دارالعلوم کی قدیم روداد میں آپ کی غزلیں، نظمیں اور مرثیے آج بھی محفوظ ہیں۔ سادگی، تقویٰ، ملنساری اور وفا شعاری کے ساتھ ساتھ علمی صلاحیتیں آپ کے خاندان کا خاص وصف ہیں۔
مولانا شمس نوید صاحب کے بڑے بھائی مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی حیدر آباد کے

عثمانیہ کالج میں عربی ادب کے استاذ اور اردو کے بہترین شاعر اور مصنف تھے۔ آپ نے کل سات کتابیں لکھی ہیں۔ دوسرے بڑے بھائی مسعود جاوید عثمانی صاحب بھی ایک مایہ ناز مصنف تھے۔ آپ نے بہت سے جاسوسی ناول لکھے ہیں، جو لکھنؤ سے شائع ہوا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ آپ لکھنؤ کے حسین آباد انٹر کالج میں انگریزی کے لیکچرر بھی تھے۔ ان کے علاوہ مولانا شمس نوید صاحب کے چچازاد بھائی ماہنامہ تجلی کے مدیر عامر عثمانی صاحب کو کون نہیں جانتا کہ آپ جیسا قلمکار تو ہندوپاک میں کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔

بہرحال عمر فاروق عاصم، زبیر افضل عثمانی، یوسف عثمانی، شمیم عثمانی جیسے زود گو اور مستند شاعر آپ ہی کے برادران اور خاندان کے افراد ہیں۔ غرض یہ کہ شاعری آپ کے خاندان کے افراد کی سرشت میں ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آپ کے بھتیجے عبداللہ راہیؔ اور دانش عامری دور حاضر کے مستند اور معتبر شعراء میں ہیں اور یہ سلسلہ ان سے آگے کی نسل میں بھی رواں دواں ہے۔

شاعر کی حیثیت سے مولانا شمس نوید صاحب کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ویسے بھی مولانا شمس نوید صاحب اس زمانے کے شاعر ہیں جس زمانے میں شاعری ادب کا گہوارہ ہوا کرتی تھی، زبان دانی اور زبان شناسی کی علامت ہوا کرتی تھی، تسکین ذوق کے علاوہ علمی سرمایہ ہوا کرتی تھی۔ آج تو شاعری کے نام پر چیخ پکار کرکے سامعین کے جذبات کے ساتھ کھیلا جاتا ہے، سیاسی خبروں کو چار چار

مصرعوں میں سمیٹ کر اسٹیج سے ایسا ایسا کلام حاضرین کی سماعتوں کے حوالے کیا جاتا ہے کہ باذوق و علمی مزاج شخص تو شاعروں کے نام ہی سے کترانے لگتے ہیں۔ رہی سہی کسر گلے باز شاعروں نے پوری کر رکھی ہے۔

مولانا شمس نوید صاحب ایک خاندانی شاعر تھے۔ اردو فارسی کی مکمل استعداد رکھنے والے زباں شناس شاعر جن کی شاعری میں معاشرے کی خرابیوں کا کرب بھی ہوتا ہے اور آخرت کی فکر کا جذب بھی۔ مولانا شمس نوید صاحب فقط الفاظ سے کھیلتے نہیں تھے بلکہ ہر ایک لفظ کو اس کی خاص معنویت کے ساتھ اپنے اشعار میں اس طرح استعمال کرتے تھے کہ وہ لفظ زندہ ہو جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ان کی نظم 'جانِ مدینہ' کے یہ تین مصرعے دیکھئے:

وہ جس کو باپ کا سایہ نہ ماں کا پیار ملا
حریف قوم ملی گرم ریگ زار ملا
برائے نوعِ بشر قلبِ بے قرار ملا

یہاں برائے نوعِ بشر قلب بے قرار میں حضورؐ کے دل کی اس بے قراری کا عالم بیان کیا ہے جو امت کو جہنم سے بچانے کے لئے مسلسل آپؐ کے دل کو بے چین اور مضطرب کیے رکھتی تھی۔ اسی بے قراری میں آپ امت کے لئے راتوں کو رو رو کر دعائیں کرتے تھے۔ یہی وہ بے قراری ہے جس کے سبب آپؐ کہتے تھے کہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میری امت دوزخ کی طرف بڑھ رہی ہے اور میں کمر پکڑ پکڑ کے لوگوں کو جہنم میں جانے سے روک رہا ہوں۔

شمس نوید صاحب کی شاعری میں زبان کی دلکشی کے ساتھ ساتھ سادگی کا عنصر بھی نمایاں رہتا ہے۔ ان کی غزل کے یہ ابتدائی تین شعر دیکھئے:

دل بدلتی ہے جاں بدلتی ہے
آرزو دوجہاں بدلتی ہے

عقل کروٹ جہاں بدلتی ہے
قید سودوزیاں بدلتی ہے

رخ بہت داستاں بدلتی ہے
پر حقیقت کہاں بدلتی ہے؟

مولانا شمس نوید صاحب ایک فطری شاعر تھے اس لیے ہر موضوع پر شعر کہنے کی قدرت اور صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی دور میں وہ گھر سے دور رہتے تھے اور ان کی اہلیہ یہاں دیوبند میں رہتی تھیں جس کی وجہ سے مسلسل خط وکتابت کا ایک سلسلہ قائم تھا۔ محترم کے یہ خطوط بھی ادبی سرمایہ ہیں جن میں بیوی سے مسلسل محبت بھرے جذبات کے ساتھ گفتگو کے علاوہ زبان کی چاشنی کا ایسا ادیبانہ رنگ ہوتا تھا جس سے ان کے تحریر کردہ خط میں مزید جان پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ خطوط نثر کے علاوہ کبھی کبھی منظوم بھی ہوا کرتے تھے۔ فطری شاعر کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات بہت آسانی کے ساتھ شاعرانہ اسلوب میں بیان کرنے کی مکمل قدرت رکھتی ہے۔ مولانا شمس صاحب کا لکھا ایک منظوم خط ان کی اسی صلاحیت و قدرت کے نمونے کے طور پر یہاں پیش کر رہا ہوں۔ جو فقط ایک خط نہیں بلکہ اپنی بیوی سے محبت کرنے والے حساس شوہر کے دل کا آئینہ ہے۔ ایسا آئینہ جس میں محبت

بھرے جذبات واحساسات کے علاوہ فکر معاش کا ذکر بھی ہے اور زندگانی کی تگ ودو کا عکس بھی۔ جس میں غمِ جدائی کا کرب بھی ہے اور راہِ حیات میں یادوں کے شجر سایہ دار کا تذکرہ بھی۔ مولانا کی شاعری کا یہ انداز بھی آپ ملاحظہ فرمائیں:

شریک حیات کے نام

شریک روح یہ دوری دلوں کو شاق بھی ہے — بنامِ فرض مگر لذت فراق بھی ہے
میں جبر زیست نہیں، اس کو فرض کہتا ہوں — تری حسین تمنا کا قرض کہتا ہوں
حقیقتوں کے تقاضے سمجھ کے چلنا ہے — ہر ایک خواب کو تقدیر سے بدلنا ہے
میں تجھ سے دور سہی زندگی سے دور نہیں — یہ واقعات کا احساس ہے غرور نہیں
ترے سکون کی تعمیر کا جنوں ہے مجھے — خبر نہیں غم دوراں پسند کیوں ہے مجھے
نشاط و کیفِ محبت کا ارتعاش بھی ہے — مگر حیات میں اک منزلِ معاش بھی ہے
طلب میں خون پسینے کا رنگ بھرتا ہوں — میں زندگی کی حسیں آرزو پہ مرتا ہوں
قدم قدم پہ تری یاد کا سہارا ہے — ترے نثار غم زیست کتنا پیارا ہے
یہ کاوشوں کا تسلسل یہ کش مکش یہ فشار — نہ زندگی سے بغاوت نہ زندگی سے فرار
تری 'لطیف محبت کا اعتماد' لئے — دیار غیر میں جیتا ہوں تیری یاد لئے

یہ خشک زیست کی رفتار جب تھکا دے گی
ترے خلوص کی جنت مجھے صدا دے گی

اسلام کی سربلندی اور امت کی حقیقی فلاح کا جتنا خیال مولانا شمس نوید صاحب کے دل و دماغ پہ حاوی رہتا تھا، اتنا ہی ان کی زندگی میں اس کا اثر صاف جھلکتا ہوا نظر

آتا تھا۔ یہی رنگ ان کی شاعری میں بھی رہا اور ان کی نثر میں بھی۔ 'منزل' کے عنوان سے ان کی نظم کا یہ ایک حصہ ملاحظہ کریں جو دور حاضر کے حالات اور مسلمانوں کی موجودہ صورت پر ایک غمگین و سوگوار دل کی کیفیت بیان کرتا ہے:

شبِ جہاں میں مذہبی چراغ ہی نہیں کہیں
تقدسِ دھیان کا سُراغ ہی نہیں کہیں
یہ جنسیات کی تپش جبلّیات کی خلش
چمن چمن روش روش سرور و رقص کی کشش
خدا کرے کہ جنگ ہو دماغ و دل کے درمیاں
نہیں یہ منزلِ جہاں نہیں یہ منزلِ جہاں

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی نظمیں اور غزلیں مولانا کی علمی میراث کے طور پر موجود ہیں جو 'حیاتِ شمس' میں 'منظومات شمس' کے نام سے شائع کی جارہی ہیں۔ یہاں فقط مولانا کی شاعری کے عنوان سے چند باتیں کرنی تھیں جو پیش کردی گئیں۔

☆☆☆

ساتھی-ہر موسم کے

اس عنوان کے تحت کچھ ایسے خوش نصیب حضرات کے تاثرات اور واقعات پیش ہیں جو مولانا کے ساتھ مشکل حالات میں بھی نہ صرف مضبوطی سے کھڑے رہے بلکہ ہر طرح سے ان کے مشن کا تعاون کیا اور انھیں کے ہو کر رہ گئے۔ جاوید انجم

محمد ارشد غنی : دعوتِ دین کی حکمت

ایک مرتبہ حضرتؒ اسپتال میں داخل تھے۔ شاید ان کے گردے کا آپریشن ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ مزاج پرسی کے لئے گئے ہوئے لوگ ان کے آس پاس بیٹھے تھے اور ناشتہ کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک صفائی کرنے والا وہاں آگیا اور جھاڑو پونچھا کرنے لگا۔ یہ بات ان کو اندر ہی اندر افسردہ کرنے لگی کہ ہم سب لوگ کھا پی رہے ہیں اور یہ ہماری خاطر فرش صاف کر رہا ہے بس ایک سیب کی پھانک اٹھائی اور اس سے کہا۔ "بھائی! یہ ہماری طرف سے کھالو!" اس کے بہت انکار کے باوجود بھی بہر حال اپنے ہاتھ سے اسے کھلایا۔ ابھی پھانک کا کچھ حصہ بچا تھا بولے۔ بھائی اگر تمہاری اجازت ہو تو یہ بچی ہوئی پھانک میں کھالوں!۔ وہ بے حد حیرت اور استعجاب کی حالت میں تھا، بولا کہ مولانا صاحب! آپ میرا جھوٹا کھائیں گے؟

سنّتوں کے محافظ حضرت مولاناؒ نے اس کو یہ حدیث سنائی کہ ہمارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ مسلمان کا جھوٹا شفا اور غیر مسلم کا جھوٹا پاک ہوتا ہے۔ اس طرح سے کچھ لمحوں کے بعد حضرتؒ نے وہ بچی ہوئی جھوٹی پھانک کھالی۔ پھر کیا تھا وہ بے حد جذباتی ہو گیا اور اتنا متاثر ہوا کہ اسی دن شام کو اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ بھیگی پلکیں اور دینِ حق کی عظمت دل میں لے کر حضرتؒ سے ملنے آیا اور ان کی مزاج پرسی کی۔ حضرتؒ نے نبی اکرمؐ کے حوالہ سے سب کو دین کی دعوت پیش کی۔ کچھ ایسا انداز تھا ان کی دعوتِ دین کا!

ایسے ہی ایک دوسرے موقع پر بازار میں ایک پان والے کی دوکان کے سامنے جمعدار سڑک پر جھاڑو لگا رہا تھا، اس کے پاس حضرتؒ گئے اور اسے روک کر اس کے ہاتھ پکڑ کر چومے اور کہنے لگے۔ تم اللہ کی زمین صاف کرتے ہو تمہارا درجہ بہت بلند ہے! فرماتے تھے کہ ہم لوگ گیان کے 'دھوبی' ہیں جس قوم کے درمیان رہے ہیں اس کے ربانی علم کو دھول اور بھول سے پاک کر کے پیش کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ کام قرآن کی روشنی میں ہی ممکن ہے۔

محمّد اعظم شمسی : معافی میں پہل

مولانا شمس نوید عثمانیؒ میرے ساتھ کبھی صبح اور کبھی شام کے وقت کسی بیمار کی عیادت کے لئے جاتے تھے۔ کوئی شخص اگر اتوار کے اجتماع میں نہیں آتا تھا تو اس

کی مزاج پرسی کے لئے بھی اس کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ اکثر لوگ ان سے چائے کی درخواست کرتے تھے۔ اس پر وہ فرماتے تھے: آپ کو آپ کی نیت پر چائے پلانے کا ثواب مل گیا اور میں اس درمیان کسی اور کے گھر جاؤں گا تو اس کی مزاج پرسی کے ثواب میں آپ بھی شامل ہو جائیں گے۔

میری اہلیہ نے مجھے بتایا کہ جب چچی جان لمبے عرصہ سے بیمار تھیں تو حضرتؒ ان سے کہتے تھے کہ ہم دونوں جنت میں اکھٹے ہوں گے اور جوان وصحت مند رہیں گے۔ کبھی بوڑھے نہ ہوں گے اور ہمیشہ خوش رہیں گے۔ کبھی کبھی دونوں میں ہلکی سی تکرار ہو جاتی تھی تو اُس کے فوراً بعد حضرتؒ معافی مانگ لیا کرتے تھے۔ اس پر چچی جان ان سے کہتی تھیں کہ غلطی میری ہے تو پھر آپ کیوں معافی مانگتے ہیں؟ اتنا کہہ کر وہ رونے لگتی تھیں۔

تنویر احمد : رات بھر دعا کرتے رہے!

ایک مرتبہ میرے دانتوں میں شدید درد اٹھا اور دوا لینے پر بھی بار بار درد اٹھتا تھا اور میری چیخیں نکل جاتی تھیں۔ پھر میں نے شام کو حضرتؒ کے پاس جاکر اپنی تکلیف بیان کی، کیونکہ وہ ہمارے روحانی باپ تھے اور ہمارے دکھ سے وہ خود بھی غم زدہ ہو جاتے تھے۔ انھوں نے مجھے تسلّی دی اور کہا کہ آپ گھر جائیں، میں دعا کرتا ہوں۔ گھر واپسی پر مجھے درد میں کافی راحت محسوس ہوئی اور میں سکون سے سوتا رہا۔ فجر کی نماز کے بعد حضرتؒ میرے گھر تشریف لائے، مزاج پرسی کی۔ میں نے

انھیں بتایا کہ بہت آرام ہے اور اب مجھے تکلیف نہیں ہے۔ بہت خوش ہوئے اور میرے گھر کے برابر والی مسجد میں پروردگار کا شکر ادا کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ گڑگڑا کر اپنے مالک کے حضور شکریہ کے آنسو پیش کر رہے ہیں۔

ہم شام کو حسبِ معمول حضرت کے گھر پہنچے تو چچی جان نے بتایا کہ تمہارے چچا میاں رات بھر مصلّے پر رہے اور تمہارے لئے دعا کرتے رہے۔ ان کی اِس بے لوث محبت کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔

سیّد فراست علی: بارات ابھی منزل تک نہیں پہنچی ہے!

میرے ذہن میں حضرت شمس نوید عثمانیؒ سے متعلق کچھ خاص واقعات ہیں جن کو میں آپ سب کی نذر کر رہا ہوں: میں نے آج تک ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا جو شمس نوید عثمانیؒ جیسا عالم ہوتے ہوئے اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھنے والا اور اللہ سے ڈرنے والا ہو۔

اتوار کے روز ہفتہ واری درس چل رہا تھا، تمام لوگ توجہ اور خاموشی سے سن رہے تھے۔ اچانک لوگوں کا دھیان اس وقت ٹوٹا جب چاچا میاں نے درس میں شریک ایک معمر شخص سے کہا: "آپ اٹھ کر آئیں اور میرے کان کھینچیں۔" ہم سب دنگ رہ گئے۔ وہ معمر شریف آدمی اٹھ کر آئے اور وہی کیا جیسے چاچا میاں نے کہا تھا۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد چاچا میاں نے کہا: شیطان نے ابھی مجھ پر حملہ کیا تھا اور

میرے دماغ میں کہا تھا کہ تم بہت قابل ہو۔ شاید اپنے منہ سے نکلنے والے کسی لفظ پر یہ احساس دل میں پیدا ہوا ہوگا اور انہوں نے فوراً عملی توبہ کرلی۔

جب میری انجینئرنگ کی تعلیم مکمل ہوگئی، تو کسی عرب ملک میں سروس کا خیال آیا اور مشورے کے ارادے سے حضرتؒ کے پاس گیا۔ انہوں نے فرمایا: تم صرف پیسے کمانے کے لئے وہاں جانا چاہتے ہو لیکن دین تو ہجرت کر کے ہندوستان آگیا ہے۔۔۔ اب فیصلہ تمہارا ہے۔ اللہ کا روزی دینے کا جو وعدہ گلف میں ہے، وہی ہندوستان میں ہے۔۔۔ میں نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جب میری شادی ہوئی تو حضرتؒ دیوبند میں تھے اور آنا ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے مفتی الیاس صاحب کو نکاح پڑھانے کے لئے بھیجا اور مبارکباد کا ایک خط بھی بھیجا۔ جب چاچا میاں واپس آئے، میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ انہوں نے بہت دعائیں دیں اور کہا، "بارات ابھی راستے میں ہے، منزل تک نہیں پہنچی ہے اور ہماری منزل جنت ہے! جب دونوں جنت میں پہنچ جائیں گے تب شادی مکمل ہوگی۔"

شاداب احمد : شکر ہے ایک آدمی کو دین پہنچادیا

ایک دن صبح کے وقت میں سائیکل سے اپنے گھر جا رہا تھا۔ حضرتؒ مسجد واحد نور صاحب سے نفل پڑھ کر نکل رہے تھے۔ میں انھیں دیکھ کر ٹھہر گیا اور سلام کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھ سے فرمایا۔ 'بازار میں طوطارام پائپ والے ہیں، چلو اُن

کو دین کی دعوت دے کر آتے ہیں!' میں نے کہا کہ حضرتؒ رکشا کر لیتے ہیں، تو فرمایا کہ سائیکل سے ہی تمہارے ساتھ چلوں گا! وہ سائیکل پر بیٹھ گئے۔ ہم طوطا رام جی کے گھر پہنچے۔ کچھ دیر دین کی بات چلی اور پھر واپسی پر مجھ سے بولے۔ "اللہ کا شکر ہے کہ ایک آدمی کو دین پہنچا دیا!" غیر مسلموں تک اللہ کا دین پہنچانے کی تڑپ ان کے اندر اس قدر تھی کہ وہ ایک لمحہ بھی گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم لوگ گیان کے دھوبی ہیں۔ جن کا گیان ہزاروں سالوں میں وقت کی دھول سے میلا ہو گیا ہے ہمیں اسے قرآن کی روشنی میں صاف کر کے ان تک پہنچا دینا ہے۔ ایسے تھے ہمارے مربّی مولانا شمس نوید عثمانیؒ!

محمد عابد : آخرت کا پتہ بتانے والے گیانی:

گونڈا کے رہنے والے میرے ایک دوست تھے، شیتلا پرساد جی جو رام پور کچہری میں سروس کرتے تھے۔ ایک بار جب وہ بذریعہ ٹرین گونڈا سے رام پور سفر کر رہے تھے، ان کی سامنے بیٹھے ہوئے ایک مہاتما جی سے گفتگو ہونے لگی۔ ٹرین جب رام پور اسٹیشن پہنچنے والی تھی تو مہاتما جی نے انھیں ایک پرچے پر ایک تاریخ لکھ کر دی اور بتایا کہ اس دن تمہاری ملاقات ایک مہاگیانی سے ہو گی۔ کاغذ اپنے سوٹ کیس میں رکھنے کے بعد گھر آ کر شیتلا پرساد جی اس واقعے کو بھول گئے۔

میں نے کئی مرتبہ شیتلا پرساد جی کو مولانا سے ملوانے کی کوشش کی لیکن ہر بار کسی نہ کسی وجہ سے ملاقات ٹلتی رہی۔ بہر حال ایک دن وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گئے۔ وہاں قرآن کا درس چل رہا تھا اور موضوع تھا 'آخرت'۔ شیتلا جی نے درس سنا اور درس کے بعد مولانا سے ملاقات بھی ہوئی۔ وہ بہت متاثر ہوئے تھے۔ گھر واپس آنے کے بعد انہیں مہاتما جی کے دیے ہوئے کاغذ کا خیال آیا۔ "کہیں آج وہی تاریخ تو نہیں ہے؟" انہوں نے سوچا۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ مہاتما جی نے مولانا سے ملاقات کی تاریخ ہی اس پرچہ پر لکھی تھی۔ انہوں نے وہ کاغذ مجھے بھی دکھایا اور مولانا سے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

اگلی ملاقات میں ان کی بات سن کر مولانا نے فرمایا: "وہ بھی گیانی تھے۔۔۔ انہوں نے تمہیں اِس دنیا کا ایک پتا بتایا تھا۔ ہمیں ان کے علم کا احترام کرنا چاہئے۔ لیکن میں نے اُس دن تمہیں پرلوک کا پتہ بتایا تھا جہاں ہمیشہ رہنا ہے!"

اتوار کے ایک درس میں، 'ایک قوم کی تبدیلی' کی بات چل رہی تھی تو وہاں بیٹھے ایک صاحب نے تائید کرتے ہوئے 'انشاء اللہ' کہا۔ اس پر مولانا نے بڑے جلالی انداز میں فرمایا، "جس بات پر اللہ کے یہاں فیصلہ ہو چکا ہے، اس پر 'انشاء اللہ' کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

سیّد مسرت پرویز: مولٰینا کا توکّل اور اللہ کا سالن!

مولٰینا شمس نوید عثمانیؒ کسی کے گھر خاص طور سے کھانا کھانے جانے سے بہت

دامن بچاتے تھے۔ بظاہر وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ جانے آنے میں کام کا وقت خرچ ہوتا ہے۔ لیکن میں نے بارہا یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ اس سے بھی حتی الامکان احتیاط برتتے تھے کہ کوئی ان کے گھر کھانا بھیجے۔ اور یہ بھی قابل ذکر ہے کہ کھانے کے معاملے میں ان پر اللہ کا خصوصی کرم تھا۔

ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ چچی جان دیوبند اپنے گھر گئی ہوئی ہیں اور مولینا اکیلے ہیں۔ میں ان کے گھر پہنچا اور عرض کیا کہ آپ کو کھانے کی بہت دقت ہو رہی ہو گی۔ اب جب تک چچی جان واپس نہیں آئیں گی میں روزانہ کھانا اپنے گھر سے لایا کروں گا۔ کہنے لگے کہ تم کھانے کی بالکل فکر نہ کرو، مجھے تو اللہ کا روٹی سالن کھانے کو ملتا ہے۔ میں نے پوچھا، حضرت اللہ کا روٹی سالن کیسا ہوتا ہے؟ فرمایا، بازار میں آم آرہے ہیں، پودینہ ملتا ہے، میں روز دو آم اور دو روٹیاں لے آتا ہوں اور پودینے کی چٹنی پیس لیتا ہوں، دونوں وقت کا کھانا ہو جاتا ہے اور بہت لذیذ ہوتا ہے۔ اس دن کی روٹیاں وہ لا چکے تھے، بولے آؤ تم بھی کھاؤ۔ میں سچ کہہ رہا ہوں کہ آم کی چٹنی تو میں نے بہت کھائی تھی لیکن آج تک میں نے چٹنی روٹی کا اتنا لذیذ کھانا کبھی نہیں کھایا۔ وہ تو کھالیا لیکن میں اس انتظار میں رہا کہ آم آنے کب بند ہوں گے۔ فصل کے خاتمے کے دن تھے۔ وہ روز مجھ سے وعدہ کرتے تھے کہ جس دن بھی آم ختم ہو جائیں گے تم گھر سے کھانا لے آنا۔ ایک دن میں نے دیکھا بازار میں آم بہت کم تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ کل سے کھانا لاؤں؟ فرمایا، ابھی تو ہیں۔ جب مجھے نہیں ملیں گے تو تم کھانا لے آنا۔ اگلے دن میں نے

دیکھا تو بازار میں آم کہیں نہیں تھے۔ میں خوشی خوشی مولینا کے پاس پہنچا اور کہا کہ حضرت آج تو بازار میں آم کہیں نہیں ہیں، اب کیا حکم ہے؟ فرمایا کچھ دیر میرے پاس بیٹھو اور مجھ سے دین کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ نیچے دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سن کر مجھ سے فرمایا کہ نیچے جاکر دیکھو کہ کیا آم آئے ہیں؟ میں حیران ہوا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آم تو کہیں بازار میں ہیں نہیں، کون لائے گا؟ میں نیچے اترا۔ ایک صاحب ایک آم کی پیٹی لیے کھڑے تھے۔ بولے کہ یہ آم ملیح آباد سے کلیم اللہ صاحب نے بھیجے ہیں۔ میں پیٹی لے کر اوپر پہنچا تو مسکرائے اور فرمایا کہ دیکھو اللہ نے آج کا سالن بھیج دیا۔ اتفاق سے اسی وقت کچھ اور لوگ آگئے۔ مولینا نے دو۔دو آم سب کو تقسیم کیے۔ پیٹی خالی ہوگئی اور صرف دو آم باقی بچے۔ کہنے لگے، یہ آج کے کھانے کے ہیں، کل کا اللہ مالک ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ کل کا کھانا؟ بولے کہ اگر میرا انتظام نہ ہو تو تم لے آنا۔

میری امیدیں اگلے روز پر ٹکی تھیں۔ صرف دو آم بچے تھے وہ اسی دن ختم ہو جائیں گے۔ میں اگلے دن ذرا جلدی ہی پھر پہنچ گیا اور پوچھا کہ حضرت کیا کھانا لے آؤں؟ میری تمنا اور ان کے توکل کا مقابلہ چل رہا تھا۔ آج اللہ کا سالن ان کے یہاں ابھی تک تو نہیں تھا۔ میں ڈر بھی رہا تھا کہ پھر کہیں سے آم نہ آجائیں۔ مولینا بولے میرے پپاس ذرا دیر بیٹھو اور پھر مجھ سے دین کی باتیں کرنے لگے۔ دروازے پر آج پھر دستک ہوئی اور میرا دل دھک سے رہ گیا۔ مولینا نے مجھ سے

کہا جاؤ دیکھو، شاید تمہاری چچی جان آ گئیں۔ میں اٹھا۔ ہو گا کوئی۔ اب ایسا بھی کیا کہ جو وہ سوچیں گے وہی ہو تا چلا جائے گا؟ نیچے پہنچا تو چچی جان رکشا سے اتر رہی تھیں۔ ان کا سامان لے کر اوپر آیا تو خوش دلی سے فرمایا کہ اللہ نے میرے کھانے کا انتظام تو کر دیا اور تمہیں تمہاری نیت کا ثواب مل گیا۔ ان کا توکل میری تمنا سے آگے تھا اور ہمیشہ آگے رہا۔

ایسے نہ جانے کتنے واقعات ہم سب کے سامنے ان کے تعلق سے پیش آتے رہتے تھے او آج میں سوچتا ہوں کہ کاش اس توکل کا ایک حصہ بھی اگر ہم سب میں تقسیم ہو جائے تو کسی کو زندگی میں کبھی کوئی پریشانی نہ ہو۔

حضرت مولٰنا جب میرے گھر تشریف لاتے تھے، میں اپنی بیٹھک میں ہی ان کا استقبال کیا کرتا تھا اور وہ مجھے اپنے مواعظ حسنہ سے نوازا کرتے تھے۔ ایک دن جب وہ گھر پر آئے تو مجھے اپنے گھر کے سامنے والی مسجد میں لے گئے۔ وہاں پر میں نے ان سے سوال کیا کہ آج آپ میرے گھر پر کیوں نہیں بیٹھے؟ ان کا جواب حیران کرنے والا تھا: آپ مجھے برائے مہربانی بتائیں، کیا آپ کا گھر اللہ کے گھر سے بھی افضل ہے؟ اگر ہے تو آپ وہاں لے چلئے، ہم وہیں بیٹھتے ہیں! میں خاموشی سے مسجد میں بیٹھ گیا اور اپنے اصرار پر شرمندہ بھی ہوا۔

محمد خالد شمسی : ان کی دعائیں قبول ہوتی تھیں!

ایک دن میں اپنی دوکان میں غمگین اور اداس بیٹھا ہوا تھا کہ مولٰناؒ تشریف

لائے اور اس کی وجہ دریافت کی تو میں نے تقریباً روتے ہوئے انھیں بتایا کہ میری شدید تمنا ہے کہ میرا بیٹا ڈاکٹر بنے، لیکن اس کو آگے کی پڑھائی میں زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارے یہاں لڑکے ہائی اسکول کر کے اپنے کاروبار میں لگ جاتے ہیں! اس وقت میڈیکل میں داخلہ آسان نہیں تھا۔ حضرتؒ مجھے برابر والی کیبن میں لے گئے اور دعا کرنے کے بعد فرمایا۔ "ہو جائے گا!" پھر اسباب بنتے چلے گئے اور آج الحمدللہ میرا بیٹا ڈاکٹر ثاقب شہر کے مشہور ڈاکٹروں میں سے ایک ہے۔

ایک مرتبہ میں نے ایک خواب دیکھا کہ مولٰینا کا انتقال ہو گیا ہے۔ مولٰینا جب تشریف لائے تو میں نے بڑی ہمّت کر کے کہا کہ آپ بُرا نہ مانیں، میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں! یہ سُن کر حضرتؒ نے مسکراتے ہوئے مجھے دعائیں دیں اور کچھ دنوں بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہِ وانا الیہِ راجعون۔

مسرور احمد (پرویز) خاں : صبر اور دیانت داری کے پیکر

ایک دن ہم چند لوگ حضرت شمس نویدؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ چچی جان نے ہم سے قدرے سخت لہجے میں کہا، "تمہارے چچا میاں کھانے پینے اور پہننے کا خیال نہیں رکھتے ہیں ان کو سمجھاؤ!" حضرتؒ نے بڑے صبر سے ان کی بات سُنی اور وہاں پر موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "دیکھو، میری شریک حیات مجھ سے

کتنی محبت کرتی ہے! اور اسے میری کتنی فکر ہے!"

حضرتؒ میرے گھر اکثر فجر کی نماز کے بعد آتے تھے اور ایک صفائی ملازم سے ان کا سامنا ہوتا تھا۔ باقاعدہ ان سے سلام دعا کرتے، ہاتھ ملاتے اور ان کی خیریت معلوم کرتے تھے۔ اپنے گھر کے لئے بجلی گھر میں ایک کنیکشن کے لئے درخواست دی۔ منظوری بھی مل گئی، لیکن میٹر لگنے میں کچھ دن لگے۔ سخت ضرورت کے باوجود بغیر میٹر بجلی استعمال کرنے کے بجائے کافی دن اندھیرے اور گرمی میں رہنا گوارا کیا۔ نفل نمازوں کی مجھے خاص تاکید کرتے تھے اور اُن کی بتائی ہوئی آٹھ رکعتوں کی پابندی سے زندگی کی مشکل راہیں آسان تر ہوتی گئیں۔ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

تُو تو جس خاک کو چاہے، وہ بنے بندۂ پاک
میں خدا کہہ دوں کسی کو تو خفا تُو ہو جائے

محمد سعید : ایک عجیب خواب!

حضرت شمس نویدؒ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۸ میں ایک انتہائی خوش گوار تجربہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے جب انھوں نے پہلی مرتبہ مجھے گلے لگا کر میرا ماتھا چوما تھا اور اُس لمس کا سکون میرے لئے اُس بچے کی طرح تھا جو وہ اپنی ماں کی گود میں محسوس کرتا ہے۔ ایسا ہی تجربہ میرے ایک دوست کا ہے جو بے حد شرارتی اور بری عادت کا تھا۔ میں اسے اتوار کے اجتماع میں لے گیا۔ بعد میں

حسب معمول حضرتؒ نے سب سے مصافحہ کیا اور بغلگیر بھی ہوئے۔ میرے دوست نے بعد میں بتایا کہ ان سے گلے لگ کر میری کپکپی بن گئی اور مجھے ایسا لگا کہ شیطان میرے اندر سے بھاگ رہا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ہم نوجوانوں کو نصیحت کی تھی کہ جب کبھی تم لوگوں کا گانا گانے کا من ہو تو سورۂ فاتحہ گنگنا لیا کرو۔ اس بات کا اثر آج بھی ہم پر ہے۔

ایک دن جناب طارق صاحب کے گھر میٹنگ چل رہی تھی۔ میٹنگ ختم ہونے پر سب لوگ حضرت سے ہاتھ ملانے لگے۔ لوگ زیادہ تھے اس لئے میں مصافحہ نہیں کر سکا۔ بعد میں میں نیچے آیا تو میں نے دیکھا کہ حضرت وہاں کھڑے ہیں اور میرے پاس آنے پر انھوں نے مجھے گلے سے لگایا اور مجھ سے اوپر ہاتھ نہ ملانے پر افسوس جتایا۔

میں آخر میں اللہ کو گواہ بنا کر ایک عجیب خواب کا ذکر کرنا چاہوں گا جو میں نے ایک مرتبہ دیکھا تھا حالانکہ میں اب بھی ان کو خواب میں کبھی کبھی دیکھتا ہوں۔ وہ خواب اس طرح سے تھا: میں اور زبیر کے والد، مولیٰنا کی قبر پر گئے ہیں۔ قبر پر ایک سفید چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ زبیر کے والد نے مجھ سے کہا۔ سعید! چادر ہٹا کر دیکھو حضرت کیا کر رہے ہیں؟۔ چونکہ قبر کے اندر سے کچھ لوگوں کے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے چادر اٹھا کر دیکھا تو مرحوم، رسول اکرمؐ کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، سرتاجِ دوعالم کے ساتھ !۔ پھر میری آنکھ کھُل گئی۔

ڈاکٹر محمد زبیر خاں : ایسی محبت جو سب کے لئے یکساں تھی!

مولانا شمس نوید عثمانیؒ سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں بچپن سے نکل کر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے ہی والا تھا۔ زندگی کے اصلی مقاصد سے نابلد اور کمسن۔ ماسٹر علیم صاحب کا میں احسان مند ہوں کہ ان ہی کی وجہ سے میں اس عظیم سلسلہ سے جڑ گیا اور مجھ جیسے ایک ناتواں تنکے کو سہارا دے کر ٹوٹنے اور ڈوبنے سے بچالیا۔

مولانا سے ملاقات کے کچھ مہینے تو صرف یوں ہی گزر گئے۔ ثوابِ دارین حاصل کرنے کی چاہ میں، لیکن آہستہ آہستہ ان کی اور اُن کے ساتھیوں کی صحبت کا ایسا چسکہ پڑ گیا کہ کہیں اور اچھا ہی نہیں لگتا تھا۔ ایک ایسی انوکھی دنیا جہاں سبھی ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے اور متفکّر رہتے تھے۔ ایسی شفقت اور محبّت جواب تک اور کہیں میسّر نہیں ہوئی تھی۔ سوچتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کیا دنیا ایسی بھی ہوتی ہے؟ مولٰینا کی آہیں اور سسکیاں دل کو چیرنے لگیں اور ان کی آنکھوں کی نمی اپنی آنکھوں میں اترتی محسوس ہونے لگی اور ان سے محبت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ایسی محبّت جو سب کے لئے برابر تھی۔

میرے حلقۂ احباب میں دوست تو بہت تھے لیکن سنجیدہ لوگ کم تھے۔ ان میں سے دو لوگوں کو میں اپنے ساتھ حضرتؒ کے گھر لے گیا اور ان کے ساتھ بھی وہی حادثہ پیش آیا۔ دونوں کے حصہ میں عمر قید آئی اور آج تک وہ مولانا کے اسیر ہیں۔

ایک اور شخص تھا جس کے ہوٹل میں ہم لوگ خالی وقت میں چائے پینے جاتے تھے، وہاں بھی مولانا کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ وہ بے حد شاطر تھا لیکن ہماری باتیں سُن کر اس نے بھی مولانا سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور آخر کار میں اسے لے کر مولانا کے پاس گیا۔ اس دن وہ پاجامے اور بنیان میں بیٹھے تھے اور وہاں ایک مہمان بھی پہلے سے موجود تھے۔ پلیٹ میں ایک اکلوتا کیلا بچا ہوا رکھا تھا۔ اب اس میں سے آدھا بطور مہمان میرے ساتھی کو کھانا تھا اور بچا ہوا آدھا مجھے۔ حضرتؒ کی صحبت نے اس پر عجیب سا لرزہ طاری کر دیا اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ بغیر کچھ کہے اس کی ساری شرارت اور چرب زبانی چھو منتر ہو گئی اور بمشکل تمام اس نے مولانا کے کہنے پر آدھا کیلا کھا کر باقی بچا ہوا مجھے دے دیا۔ مولانا نے اس سے کہا تھا کہ مسلمان کا جھوٹا دوسرے مسلمان کے لئے شفا ہوتا ہے۔ اس دن بس مختصر سی ملاقات ہی ہو پائی۔ جس شخص سے محلّے کے لوگ پناہ مانگتے تھے آج وہ خود کسی اللہ والے کی پناہ میں آگیا تھا۔ اس کے بعد ایک دن پھر اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی اور اب مولانا سے کوئی بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

نعیم میاں : بازار میں جھوٹ سچ بہت ہوتا ہے!

ایک مرتبہ حضرتؒ ہمیں بازار سے واپسی پر گھر جاتے مل گئے۔ بہت جلدی میں تھے، ہم نے سلام کیا اور تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد بولے: 'جب کبھی بازار

سے گزرا کرو تو صلاۃ وسلام پڑھا کرو اور تیزی سے گزرا کرو کیونکہ بازار میں جھوٹ سچ بہت ہوتا ہے!'

حضرت مولیناؒ کی ایک بیش قیمت صفت یہ تھی کہ وہ چھوٹے بڑے سب کے ساتھ برابر کا سلوک کیا کرتے تھے، ان کی شفقت اور احترام سب کے لئے برابر تھا۔ ہمیں کبھی ایسا نہ لگا کہ حضرت ہمیں کسی سے کم تر سمجھتے ہوں۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے افسوس ہے اور میرا تجربہ ہے کہ یہ صِفت اس حد تک مجھے کسی اور میں دکھائی نہ دی اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ جو آنسو میرے والد محترم کی موت پر بھی نہ نکلے تھے وہ حضرت شمس نویدؒ کے انتقال پر رک ہی نہیں رہے تھے۔ میری پرور دگار سے یہ التجا ہے کہ وہ ہم سب ساتھیوں میں وہ صفات پیدا کر دے جو ایک دین کے داعی میں ہونی چاہیئں اور جو حضرت میں ان گنت تھیں۔ آمین!

محمد سہیل خاں : خود کو پیش کرنا بہترین مہمان نوازی

کیا آپ نے 'محبت' کو دیکھا ہے؟ یہ تو ایک جذبہ ہے اور جذبات کو کون دیکھ سکتا ہے؟ لیکن اگر یہ جذبہ ایک جسم کا روپ لے لے اور زندہ مجسمہ بن جائے تو اس دور میں اُس کا نام شمس نوید عثمانی تھا۔ ان کے لئے آپ رحم، معافی وغیرہ کتنے ہی الفاظ کا استعمال کر سکتے ہیں لیکن ان کی سب سے بڑی صفت تھی، پوری انسانیت سے محبّت۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس خادم نے بھی ان کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔

مولانا سے متعلق ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک شادی

میں آیا ہوا تھا۔ مُنے بھائی اور چندو بھائی میرے ساتھ تھے۔ وہاں سے مولانا کا گھر بھی قریب تھا، لہذا میں دونوں دوستوں کو لے کر مولانا سے ملنے چلا گیا۔ ان کی مہمان نوازی کا رنگ ہی نرالا تھا۔ عام طور پر لوگ مہمانوں کی خاطر تواضع مٹھائی اور سموسے وغیرہ سے کرتے ہیں، لیکن مولانا ان چیزوں کی جگہ خود کو ہی پیش کر دیا کرتے تھے۔ وہ اپنے کتابوں والے کمرے میں ہمیں لے گئے اور ہمارے بیچ جو باتیں ہوئیں، ان کا اختتام بھیگی پلکوں اور سجدے کے ساتھ ہوا۔ وہ عام طور پر ہاتھ ملا کر واپس نہیں کھینچتے تھے اور دوسرے لوگ ہی اس کی پہل کرتے تھے۔ مگر اُس روز ان کا رنگ ہی کچھ اور تھا! باری باری سے تینوں کو سینے سے لگایا، ماتھے پر بوسہ دیا اور کہا۔ "اے اللہ! آپ نے رسول مقبولؐ کی تین تین پر چھائیاں بھیجیں ہیں، اے اللہ! ان پر چھائیوں کے سہارے محمد ﷺ کی مقدس پیشانی پر پیار کر رہا ہوں۔"

آخر میں میں اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ میں، محمّد سہیل خان مولانا شمس نوید عثمانیؒ کے مشن کا پورا حق ادا نہ کرنے کی وجہ سے ان کی وراثت کا کافر (قدر نہ کرنے والا) ہوں۔ اللہ! مجھے ایمان والوں میں شامل کرے، آمین!

محمد شکیل خاں: جس محفل میں شوٹنگ ہو، اس میں ہمارا کیا کام؟

جب میں اپنی شادی کا کارڈ لے کر مولیٰنا کے گھر گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں آپ کے لئے گھر سے ہی دعا کر دوں گا، شادیوں میں اس لئے نہیں جاتا کہ وہاں شوٹنگ

ہوتی ہے اور جس محفل میں ہمارے نبیؐ موجود نہیں، اُس میں ہمارا کیا کام؟
میں نے حضرت کو یقین دلایا کہ میں نے سب سے بات کرلی ہے اور میری شادی میں کسی طرح کی ویڈیو گرافی نہیں ہوگی، آپ مطمئن رہئے۔ یہ کہہ کر میں چلا آیا۔ میرے نکاح کے وقت وہ مسجد میں تشریف لائے۔ میری نظریں اپنے 'مربّی' کو تلاش کر رہی تھیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرتؒ میرے برابر ہی تشریف فرما ہیں۔ نکاح کے فوراً بعد مجھے گلے سے لگا کر ڈھیر ساری دعائیں دیں اور جلد ہی اجازت لے کر چلے گئے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ چچی جان بھی اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی تقریباً تین چار مہینے میرے گھر پر ہی رہیں اور وہیں انھوں نے آخری سانس لی۔ مجھے اور میرے بیوی بچوں کو ان کی ٹوٹی پھوٹی خدمت کرنے کا کئی برس تک سنہری موقع ملا۔ بے حد بیمار اور معذور ہو گئی تھیں۔ سنائی نہ دینے کی وجہ سے لکھ کر بات کرنی پڑتی تھی۔

ایک مرتبہ میری اہلیہ کو انھوں نے بتایا کہ جب میں آٹا گوندھنے جاتی تھی تو تمہارے چچا میاں میرے پاس پانی کا لوٹا بھر کر رکھ دیتے تھے اور جب کپڑے دھوتی تھی تو یہ دعا کرتے تھے کہ اے اللہ! جس طرح خدیجہ میرے کپڑوں کو دھو کر صاف کر دیتی ہے، اسی طرح تو اس کو گناہوں سے پاک کر دے! اس کے بعد دھلے ہوئے کپڑے تار پر سکھانے کے لئے ڈال دیا کرتے تھے۔ طبیعت

خراب ہونے پر ہاتھ پیر دبا کر میری خدمت اور دل جوئی کیا کرتے تھے۔

سُمُو طارق : تم بڑی ہو کر کیا بننا چاہو گی؟

اُف یہ جادہ کہ جسے دیکھ کے جی ڈرتا ہے
کیا مسافر تھے جو اِس راہ گزر سے گزرے

۲۶ اگست ۱۹۹۳ کو مولانا شمس نوید عثمانیؒ کے وصال کی خبر میرے وجود پر کسی بجلی کے گرنے سے کم نہ تھی۔ حالانکہ ابھی میری عمر بس ۱۰ ہی سال تھی اور میں بہت زیادہ کچھ بھی سمجھ سکنے سے قاصر تھی۔ بس اتنا سمجھ میں آرہا تھا کہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہو چکا ہے۔ اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے جو اب شاید کبھی جُڑ نہ سکے گا۔ میں انہیں شمس نانا کہتی تھی۔

شمس نانا سے اتنے گہرے لگاؤ کی وجہ شاید اُن سے بہت زیادہ رابطہ تھا۔ شعور آنے سے پہلے سے اُن کے تمام اجتماعات میں شمولیت، دِل میں سرایت کرنے اور اندر تک چیر ڈالنے والی اُن کی بھرائی ہوئی آواز، زار و قطار بہتے آنسو جیسے میرے تحت الشعور کا حصہ بن چکے تھے۔

ایک اور چیز تھی۔ مجھے یہ تو نہیں یاد کہ کیوں، لیکن حضرت اکثر ہمارے گھر تشریف لایا کرتے تھے۔ اور جیسے ہی اُن کے آنے کا پتہ چلتا میری نانی امّی کا اشارہ ہوتا کہ میں مریم (میری ایک یا دو سالہ معذور چھوٹی بہن) کو لے کر اُن کے پاس چلی

جاؤں تا کہ وہ اُس کے لیئے دُعا فرمادیں۔ میرے لیئے یہ جیسے ایک معمول سا تھا۔ اُس دن بھی یہی ہوا۔ وہ آئے اور میں حسبِ معمول مریم کو گود میں لے کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔

شمس نانا اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر ہونٹوں پر خفیف سا تبسم آگیا۔ وہ صوفہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سلام کر کے میں اُن کے پاس ہی تخت پر ٹِک گئی۔ شمس نانا اکثر کہیں کھو جاتے تھے۔ خیالوں کے تلاطم سے باہر آئے تو مُجھ سے سوال کیا کہ بیٹی بڑی ہو کر کیا بنو گی؟ میری عمر اُس ٹائم ۸ یا ۹ سال کی رہی ہو گی۔ میں نے جواب دیا کہ وہی کُچھ بننا اور کرنا ہے جو آپ اور ابوجی کرتے ہیں۔ یہ سُن کر جو چہرہ روشن ہوا اور آنکھوں میں چمک آئی، وہ باقی سب یادوں پر حاوی ہے۔

اس ایک یاد کے مقابلے میں اُن کا اکثر و بیشتر گھر آنا، میرا اُن کے سارے پروگراموں میں جانا اور ان کی حج سے واپسی پر دلّی سے رامپور تک کے سفر (جو اُن دنوں کار سے ۷ یا ۸ گھنٹے کا ہوا کرتا تھا) میں اُن کی ہمراہی کی ساری یادیں اور باتیں دُھندلی پڑ جاتی ہیں۔ جب بھی خیال آتا ہے تو تصور میں بے اختیار بس وہ چمکتا ہوا چہرہ اور ڈرائنگ روم میں داخل ہونے والے ہر شخص کو جوشِ مسرت سے کھنکتی ہوئی آواز میں یہ بتانا کہ دیکھو یہ بچّی کیا بننا چاہتی ہے۔

آہ! ان کی ہر بچے کے بارے میں یہ فکر کہ وہ بڑا ہو کر کیا بننا چاہتا ہے اور بار بار

میرے حق میں دُعا کرنا کبھی کبھی یہ احساس دِلاتا ہے کہ آج شاید جو کچھ ہے، انہی دُعاؤں کا ثمرہ ہے۔

☆☆☆

جب میں نے حضرتؒ کا حکم نہیں مانا!

۱۹۸۸ میں جب کتاب 'اگر اب بھی نہ جاگے تو۔۔۔' کے پہلے ایڈیشن کی کتابت مکمل ہو گئی تو چھپائی کے لیے بھیجنے سے قبل میں مسوّدہ لے کر مولٰنا کے پاس پہنچا۔ سرورق پر کتاب کے نام کے ساتھ لکھا تھا۔ **"نتیجہ ٔ فکر: مولٰنا شمس نوید عثمانی ـــ ترجمانی و تحریر: سیّد عبداللہ طارق"** حضرتؒ نے اسے دیکھ کر فرمایا: میرے نام کے آگے سے مولٰنا ہٹا دو، میں مولانا نہیں ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ مولٰنا کسی سند یافتہ کو نہیں کہتے، آپ ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں، کتاب میں نے تحریر کی ہے، مجھے اس کا حق دیجیے کہ میں آپ کو جو سمجھتا ہوں، وہ آپ کے نام کے ساتھ لکھوں۔ مولٰنا سسکیوں کے ساتھ رونے لگے۔ مجھ سے بولے: "میں مولانا نہیں ہوں، میں اللہ کو کیا جواب دوں گا؟" اس معاملے میں مَیں بھی مفاہمت کرنے کو تیار نہ تھا۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ کو جواب دہی کی ذمہ ّداری میری ہے کیونکہ میں نے لکھوایا ہے۔

یہ واقعہ ان شاذ مواقع میں سے ہے جب میں نے علی الاعلان ان کی حکم عدولی کی تھی۔ (سیّد عبداللہ طارق)

اِک چراغ اور بجھا

عمر فاروق عاصمؔ عثمانی

موت نے آہ ترا سازِ نفس توڑ دیا
تُو تو اک ابرِ کرم بوئے وفا تھا اے دوست
تو کہ اِک چشمۂ رحمت تھا زمانہ کے لئے
تُو تو اک پیکرِ تسلیم و رضا تھا اے دوست

تیرا تقویٰ، تری چاہت، تری باتوں کی مٹھاس
یہ وہ چیزیں ہیں زمانہ کو دکھا بھی نہ سکوں
تیرا کردار، ترا زہد، ترا حُسنِ سلوک
ان کو میں بھولنا چاہوں تو بھلا بھی نہ سکوں

میری منّی● یہ جو گزری ہے قیامت مت پوچھ
تیرے احباب کا میں حال بتاؤں کیسے
طارقؔ و خالدؔ و سجّادؔ کے دل زخمی ہیں
زخم جو ان کو لگے تجھ کو دکھاؤں کیسے

● منّیؔ: میری چھوٹی بہن۔ (اہلیہ شمس نویدؔ)

وہ مظفرؔ ہوں کہ منظورؔ و مسرتؔ اعظم
جو ملا میں نے ان آنکھوں میں نمی دیکھی ہے
تیرے افکار سے ہے بزم تو روشن اب بھی
ہاں، مگر اس میں بہت تیری کمی دیکھی ہے

آصفؔ و ارشدؔ و تنویرؔ پہ موقوف نہیں
تیرے حلقہ کا تو ہر شخص پریشاں سا لگا
ان میں پرویزؔ ہوں، شاداب یا جاوید انجمؔ
ان کے چہروں کو جو دیکھا تو بیاباں سا لگا

گردشِ وقت نہ اب چھیڑ کہ ہم تو خود ہی
گم شدہ خواب کی تعبیر بنے بیٹھے ہیں
چھن گیا صبر وسکوں، خاک ہوئی راحتِ دل
اک غم و یاس کی تصویر بنے بیٹھے ہیں

دل ہے صد چاک، جگر چھلنی، تخیل مجروح
غم کا طوفاں ہے مگر ہونٹ سئے بیٹھے ہیں
جو تری یاد میں آئے تھے مگر بہہ نہ سکے
آج پلکوں پہ وہی اشک لئے بیٹھے ہیں

(بشکریہ: الفرقان، لکھنؤ، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۳)

☆☆☆

قلم کے جادوگر۔۔۔ مولانا شمس نوید عثمانیؒ

(مولانا کی مایۂ ناز کتاب 'کیا ہم مسلمان ہیں۔۔۔؟' سے ماخوذ دو مختصر مضامین)

نئے اور پُرانے طائف

پھولوں سے زیادہ معصوم فطرت، مگر شیطنت کے گھناؤنے ماحول کے ڈھالے ہوئے شریر انسانی بچوں کی بھیڑ۔ شور مچاتی اور تالیاں بجاتی ہوئی —— آوارہ نوجوانوں کے بدمست غول۔ انسانیت کو دہلا دینے والے قہقہے لگاتے ہوئے —— بوڑھے چہرے —— لاشوں کی طرح بے روح اور گناہ کی طرح تاریک اور بے ضمیر ——

اپنی مکروہ طنز بھری جھرّیوں کے درمیان سمٹتے پھیلتے ہوئے —— اِس انسانی جنگل میں جنگلی شور کے طوفانی ریلوں کے ساتھ اینٹوں کی اندھادھند بوچھار! —— بے رحمانہ پتھراؤ، ہاؤہو کی حیوانی غراہٹیں!

یہ طائف کی سرزمین پر کس ہستی کا مجنونانہ خیر مقدم کیا جارہا تھا؟ —— آہ کون جانے —— کیا آج طائف کے سرسبز میدانوں اور خوش حال محلّوں کی آبادی

میں کوئی خطرناک ڈاکو گھس آیا تھا جسے گھیرا جارہا تھا یا اس وادی کے تاج و تخت پر حملہ آور کسی سردار کو گرفتار کیا جارہا تھا — یا اس بستی کے سورماؤں نے کسی ایسے 'خوفناک کردار' کو دھر لیا تھا جس سے ان کے عیش و آرام خطرے میں تھے؟

آہ نہیں! — ہرگز نہیں! پتھروں کی ظالمانہ بارش کے نشانے پر کوئی رہزن نہیں' بلکہ دیانت و امانت داری کا ملکی ہیرو اور بین الاقوامی نشان تھا۔ وہ دوستوں اور دشمنوں دونوں کا 'امین صادق' تھا! — ہاں اس بے رحمانہ، آخری حد تک بے رحمانہ پتھراؤ کی زد پر اُس 'انسانِ کامل' کے سوا کوئی نہ تھا جس کے نورانی قدموں میں وحشی سرداروں کا عظیم قریشی وقار سر جھکا کر یہ بھیک مانگ چکا تھا کہ وہ ایک نئے خدا کا نعرہ بند کردے تو وہ اس قابل ہے کہ عرب کا تاج و تخت اس کے حوالے کردیا جائے۔

یہ وہی پاکیزہ ہستی تھی جس کے اخلاقی انقلاب کے مقدس پیغام کو خریدنے کے لیے ریگستانِ عرب کی حسین ترین دوشیزاؤں کی بولی لگائی گئی تو شیطنت نے یہ دیکھ کر اپنا منہ پیٹ لیا کہ اس عجیب انسان کی رگوں میں جذبات کی نشیلی سنسنی کی جگہ انسانیت اور اس کے وقار کا مقدس خون کھول اٹھا اور غیرتِ انسانیت کے ایک حسین ترین جوش کے ساتھ اس کے ہونٹوں سے یہ الفاظ ادا ہوئے تھے،
"جس چیز کو چاند اور سورج کی نذر بھی نہ خرید سکے، یہ دنیا اس چیز کو دنیا کے سامان سے خریدنے کا خواب دیکھ رہی ہے — آہ یہ لوگ مجھے نہیں پہچانتے!"

میرے لیے بس ہے۔ میں پناہ چاہتا ہوں تیرے رُخ کے اس نور کی جس سے تمام اندھیرے کافور ہو جاتے ہیں۔ جس سے دونوں جہاں کی بگڑیاں بن جاتی ہیں۔ میں پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ مجھ پر تیرا عتاب ہو یا تو مجھ سے روٹھ جائے —— جب تک تو راضی نہ ہو جائے تجھے منائے جانا ضروری ہے۔" یہ کون کہہ رہا ہے؟ کس سے کہہ رہا ہے؟ کہاں کہہ رہا ہے؟

یہ کس کے در پر خدا کے رسولؐ کی دل ہلا دینے والی پکار ہے جو آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے طائف کی وادیوں میں گونجی تھی اور آج بھی کتاب کے صفحے پر اُترتی ہے تو قلم کا جگر کانپ کانپ جاتا ہے؟ یہ پکار جب خدائے سمیع و رحیم نے سنی ہو گی تو رحمت و غیرت کا کیا عالم ہوا ہو گا —— خدا گواہ ہے کہ کوئی اس کا صحیح تصور تک نہیں کر سکتا۔ تاریخ اتنا ضرور بتاتی ہے کہ ادھر یہ فریاد آپؐ کے معصوم ہونٹوں سے جدا ہوئی تھی اور اُدھر خدا کا جواب آپہنچا تھا۔ فضائے کائنات کو چیرتے ہوئے دو عظیم فرشتے فرشِ خاک پر آکھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک خود حضرت جبریلؑ تھے اور دوسرا وہ طاقت ور فرشتہ جس کے شانوں پر خدا نے پہاڑوں کے انتظام کا بوجھ رکھا ہے۔

"السّلام علیکم یا رسول اللہ ﷺ!" کمالِ ادب کے ساتھ جبریل امینؑ نے کہا تھا: "خدا نے وہ ساری گفتگو خود سُنی ہے جو آپؐ اور طائف کے بدبختوں کے درمیان ہوئی اور وہ فرشتہ آپؐ کی خدمت میں بھیجا گیا ہے جس کے سپرد پہاڑوں کا نظام

ہے۔ آپ جو چاہیں حکم دیں۔!'

بے رحم انسانوں نے جس پیغمبرؐ پر پتھراؤ کیا تھا خدائے ارحم الراحمین نے اس کے قدموں پر پہاڑوں کو لاڈالا تھا۔ حضورؐ اس بندہ نواری پر ابھی شکرِ نعمت ہی میں ڈوبے ہوئے تھے کہ فوراً دوسرا آگے بڑھا۔

السّلام علیکم یارسول اللہ ﷺ! وہ عرض کر رہا تھا "میں ہی وہ فرشتہ ہوں جو مالِک کائنات کی طرف سے آپؐ کی حکم کی تعمیل پر مامور ہوا ہے۔ اگر ارشاد ہو تو طائف کے دونوں جانب کے پہاڑوں کو ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرادوں کہ اس سر پھری آبادی کی کچلی ہوئی لاشوں پر رونے والا بھی کوئی نہ ہو۔"

کیسا عجیب و غریب وقت تھا! اے دل والو! ذرا سوچو تو سہی! ایک طرف وہ سنگدل آبادی ہے جس نے ایک انتہائی رحم کھانے والے کو پتھروں سے مارا ہے۔ اس کا انتہائی پاکیزہ اور بے لوث پیغام سن کر وحشیانہ خوشی سے تالیاں پیٹیں اور بغلیں بجائی ہیں۔ فقرے کسے اور پتھراؤ کیے ہیں۔ دوسری طرف پہاڑوں کی باگ ڈور خدا نے اپنے محبوب رسولؐ کے ہاتھ میں دے دی ہے اور پہاڑوں کے نظام پر مامور دیو پیکر فرشتہ اس سفاک بستی کے ظالموں کو سُرمہ بناڈالنے کے لیے ابرو کے ایک اشارے کا منتظر ہے اور ان دونوں لرزہ خیز مناظر کے درمیان خود ہی رحمۃ للعالمینؐ حائل ہے جس کے گھائل پیروں سے خون کے فوارے پھوٹ نکلے ہیں، جوتے لہو سے بھر گئے ہیں اور جس کے مظلوم قدم کمزوری سے

لڑکھڑانے لگے ہیں، لیکن جوں ہی اس کو محسوس ہوا کہ ظالموں کے حق میں خدا عذاب کا فیصلہ کرنے والا ہے وہ اپنے ہر زخم کی کسک کو بھول ہی گیا۔ اس وقت اس کو بس ایک ہی بات یاد تھی کہ میں حق پھیلانے اور انسانوں کو بچانے کے لیے آیا ہوں۔ بے رحموں کی بستی کی طرف اس نے غمناک نظروں سے دیکھا اور اپنے گھائل جسم کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر درد بھرا جواب دیا —— "میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ اگر یہ لوگ ایمان نہ لائے تو ان کی نسلوں میں سے ایسے لوگ ضرور پیدا ہوں گے جو اللہ کی پرستش کریں گے۔"

یہ تھا حق کی اشاعت کا وہ درد جس کی برکت سے ایک گناہ آلود بستی عذاب کی لپیٹ میں آتے آتے بچ نکلی —— آج پھر دنیا عذاب کی زد پر ہے۔ کاش خاتم النبیین ﷺ کی امت اس درد کی سچی امین ثابت ہو۔ کم سے کم کوئی ایک سینہ تو اس کسک سے پھر ایک لالہ زار بن جائے۔

☆☆☆

ایک خط مسز اندرا گاندھی کے نام

(وزیر اعظم کو لکھے ہوئے ایک طویل خط کے پہلے دو اقتباسات)

Angoori Bagh,
RAMPUR-U.P
Dated:20.12.83
To
SHRIMATI INDIRA GANDHI,
(PRIME-MINISTER OF INDIA)
NEW DELHI

My own elder sister in human flesh and blood as well as "mother-like" in the name of mother land!

Do you not see the whole earth and waters in the grip of the most disastrous deluge of fire and blood? Is it not a far more terrible one than the previous 'Maha-Jal' Palawan or Deluge of water of the times of Manu or Nooh (peace on him as the common patriarch and prophet of the Vedas, Bible and Quran)?

Humanity had then sunk in the Manu's 'Maha-Jalaplavan', in waters, all in spate as a result of human sins. But now it is sinking in a Spiritual and moral 'wreckage' on the land Itself so tragically and hopelessly as the masses are fighting each other on this sinking boat of the globe. Both the religious and political leading classes of the Temples of God and The states of human regimes stand as silent spectators, all divided within themselves in the face of the Evil Tides of the Destructive Forces and all united..... Contd.......

عیادت کا خط ایک بہن کے نام

عزیز ترین دینی وایمانی بہن نصرت سلّمہا

اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج دوسری بار تمہارے گھر پر تمہاری خیریت لینے کے لئے گیا تو تمہارا حال بھی معلوم ہوا اور یہ پتہ چلا کہ عزیز ی ائس سلمہ آئے ہوئے ہیں اور آج واپس بھی جائیں گے۔ میں نے سوچا تمہاری عیادت کا ثواب پانے کے لئے اس سے اچھا موقعہ تحریر سے فائدہ اٹھانے کا اور کیا ہو گا۔ دعا کرو کہ یہ ٹوٹی پھوٹی عیادت بھی قبول ہو جائے اور دین و ایمان کے خاص رشتہ سے ہم سب دینی بہن بھائیوں کا تعلق خاطر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبول ہو جائے۔ نیز یہ بھی سنّت ہے کہ بیمار سے دعا کرائی جائے کہ خود آنحضرتؐ نے اپنے بیمار امتیوں سے دعا کے لئے فرمایا ہے۔ نیز یہ بتایا کہ بیمار مومن یا مومنہ کی دعا قطعی بے گناہ پاک وصاف فرشتے کی دعا کے برابر ہو جاتی ہے۔ اللہ اللہ اس بندہ نواز اور بندی نواز کی بندہ نوازی؟ اس وقت میرے لئے خدیجہ کے لئے اور میرے دینی مشن کے تمام رفقاء کار کے لئے یہ دعا کرو۔ ہاتھ اٹھا کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کر (اگر ہو سکے!) کہ الٰہی! میرے بھائی کے اس دینی مشن کی پوری اصلاح بھی فرمادے، اسے پورا بھی فرما اور قبول بھی کر اور ہم سب کا خاتمہ بالخیر فرما کر اس مشن کے انعامات میں ہم سب کو ہمیشہ کے لئے شریک کر۔ آمین

اب تکلیف پر انعام کے سلسلے میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ حضرت علیؓ نے ایک

صحابی سے کہا کہ کیا میں تمہیں اسی دنیا میں ایک جنّتی عورت دکھاؤں؟ اور پھر انھوں نے سامنے سے گزرتی ہوئی ایک کالی کلوٹی بیمار بہن کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ہے جنّتی عورت! پوچھا گیا کہ یہ کیسے پتہ چلا؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ میرے سامنے حضورؐ کے پاس درخواست لے کر آئی تھی کہ میں مرگی کے شدید دوروں میں مبتلا ہوں اور دوروں میں ہاتھ پاؤں اینٹھتے ہیں تو کپڑے پھٹ جاتے ہیں اور میں ننگی بھی ہوجاتی ہوں۔ میری صحت کے لئے دعا فرمادیجئے۔ حضورؐ کچھ دیر چپ رہے پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس تکلیف پر تیرے لئے جنّت لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اگر تو صحت چاہتی ہے، جنّت کا یہ انعام نہیں تو میں صحت کی دعا کروں۔ وہ گھبرا گئی اور تڑپ کر بولی۔ حضورؐ! —— نہیں ! آپ میری صحت کی دعا نہ فرمایئے۔ ہاں اتنی دعا فرمادیں کہ دورے پڑتے رہیں مگر میں ننگی نہ ہوا کروں۔ چنانچہ ایسا ہی ہو گیا۔ الحمدللہ!

خدیجہ کی طرف سے بھی سلام و عیادت قبول ہو اور تمہارے شوہر اور تمام تیمارداروں کی خدمت میں دلی سلام ودعا عرض کرتے ہیں ہم دونوں۔

فقط والسلام تمہاری دین دنیا کی کامیابیوں کے ساتھ جلد واپسی کے منتظر ہیں۔

تمہارا ادنیٰ دینی بھائی

شمس نوید عثمانی

☆☆☆

حرم کے زائر!

(۱۹۷۹ میں کعبے کی بے حرمتی کے پسِ منظر میں
زائرینِ حج کے لئے لکھی گئی طویل نظم کے پانچ بند)

شمس نویدؔ

یہ جنتِ گم شدہ حقیقت، فزوں تو ہے اس سے کم نہیں ہے
حرم کے زائر! حرم 'زمیں' ہے فقط 'زمینِ حرم' نہیں ہے
اخوتِ بندگی کے دشمن 'لہو کے بت' ذات پات لاکھوں
قمار خانے، شراب خانے، بنامِ قتلِ حیات لاکھوں
خدا کے اس کعبۂ زمیں پر صنم کدے، سومنات لاکھوں
'حیات' اک سجدۂ مسلسل، فقط جبینوں کا خم نہیں ہے
حرم کے زائر! حرم 'زمیں' ہے فقط 'زمینِ حرم' نہیں ہے
قرونِ اوّل کے قافلوں کا یہ عالمی نقطۂ نظر تھا
اسی تڑپ سے جہادِ پیہم مسافرِ زیست کا سفر تھا
وہاں تو ہر روسیاہ انساں خدا کا شہکار تھا، بشر تھا
حرم پہ رقصِ سیاہ کاری پہ تجھ کو غصہ ہے غم نہیں ہے
حرم کے زائر! حرم 'زمیں' ہے فقط 'زمینِ حرم' نہیں ہے

لباسِ احرام وہ کفن ہے جو عمر بھر من سے زیب تن ہو
فرشتۂ موت کے خدا کی طلب سے لبّیک کا ملن ہو
نظامِ سعی و طواف میں گُم زمین و افلاک کا عدن ہو
رمیٔ جمرات کھیل ہے، گر بتانِ آذر میں خم نہیں ہے
حرم کے زائر! حرم 'زمیں' ہے فقط 'زمینِ حرم' نہیں ہے

بتانِ آذر تو آرہے ہیں جہاں میں قالب بدل بدل کر
'زیارت وحج' گھروں میں پسپا ہوئے ہیں مولیٰ کے گھر سے چلکر
اٹھا ہے پھر بولہب کا شعلہ سراجِ محمودیت سے جَل کر
اسی تصور سے سمتِ کعبہ نماز کی آنکھ نم نہیں ہے
حرم کے زائر! حرم 'زمیں' ہے فقط 'زمینِ حرم' نہیں ہے

جلائے دجّالیت نے مل کر لہو کے سیّال سے الاؤ
حرم لٹا چودھویں صدی کا، زمیں کی جڑ پہ لگا ہے گھاؤ
امامتِ مصطفےٰؐ میں واپس شبِ صفِ انبیاؑ کو لاؤ!!
یہ دورِ معراجِ علمِ قرآں مگر 'مسلماں' میں دَم نہیں ہے
حرم کے زائر! حرم 'زمیں' ہے فقط 'زمینِ حرم' نہیں ہے

☆☆☆

جن کے کردار سے آتی ہو صداقت کی مہک
ان کی تدریس سے پتھر بھی پگھل سکتے ہیں

مولانا شمس نوید عثمانیؒ — چند یادیں

مرتضیٰ ساحل تسلیمی
(معروف افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب)

مولانا شمس نوید عثمانی صاحب سے میری ملاقات پہلی بار اس وقت ہوئی جب میں پندرہ سولہ سال کا نوعمر لڑکا تھا اور گورنمنٹ رضا انٹر کالج میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ غالباً ۱۹۶۸ء کا مارچ اپریل کا مہینہ تھا۔ ان دنوں شمس نوید عثمانی صاحب محلہ شتر خانہ میں فارسی کے ریٹائرڈ پروفیسر شفیق صاحب کے متصل مکان کی چھت پر کرائے پر رہتے تھے۔ اس سے قبل میں انہیں اتنا جانتا تھا کہ یہ بہت نیک انسان اور اچھے عالمِ دین ہیں۔ سادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور مدرسہ عالیہ میں مدرس ہیں۔ میری ابتدائی تربیت والدہ محترمہ نے کی تھی اور ان کی یہ نصیحت تھی کی میں اپنے بڑوں کی خوب عزت کیا کروں اور سلام میں پہل کروں، خواہ وہ خاندان کے بڑے ہوں، محلے کے بڑے ہوں یا استاد صاحبان اور علمائے دین

ہوں۔ چنانچہ جب مولانا موصوف سے سامنا ہوتا تو میں بڑی عقیدت سے انھیں سلام علیک کرتا۔ ان سے اکثر مدرسہ عالیہ اور گویا تالاب کے بیچ سامنا ہوتا۔ وہ پیدل ہوتے اور اگر کبھی میں بھی پیدل ہوتا یا کسی دکان پر کھڑا سودا خرید رہا ہوتا تو سلام علیک کے ساتھ مصافحہ بھی ہو جاتا۔ مصافحہ میں پہل عموماً مولانا کی جانب سے ہی ہوتی۔ وہ لطیف مُسکراہٹ کے ساتھ ملتے اور دھیمے لہجے میں خیر و عافیت بھی دریافت فرمالیتے۔ اس طرح سر راہ چند لمحات کیلئے ملنے کو ملاقات کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ پھر وہ مجھے جانتے بھی کہاں تھے؟ مولانا کا یہ مشفقانہ رویہ دینی رواداری یا اسلامی بھائی چارا کہا جا سکتا ہے۔

میرے کلاس میں ایک ساتھی تھے — محمد نسیم خاں۔ وہ مجھ سے کافی بڑے تھے۔ میں ان کا احترام بھی کرتا تھا اور نسیم بھائی بھی کہتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ کلاس فیلو تھے اس لیے دوستانہ رشتہ استوار ہوا۔ انھوں نے مجھ سے کہا مرتضیٰ! منڈویل صاحب کے ٹرانسفر کے بعد انگلش کا کوئی ٹیچر کبھی کلاس میں پڑھانے نہیں آیا۔ امتحان قریب ہیں، انگلش میں کیسے پاس ہوں گے؟ ٹیوشن پڑھنا پڑے گی۔ میں نے بھی اتفاق کیا۔ وہ بولے میں آج ہی کچھ کرتا ہوں۔ وہ شمس صاحب سے ملے اور درخواست کی۔ مولانا ان کے ٹیچر رہے تھے، درخواست قبول کرلی۔

اگلے دن جب نسیم بھائی نے مجھے بتایا تو میں نے کہا وہ تو بہت اچھے انسان ہیں۔ میں ان کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ مگر کیا وہ انگلش۔۔۔؟ اور انھوں نے قطع کلام

کرتے ہوئے کہا: "ارے بیوقوف! وہ ایسے عالم ہیں جو انگلش بھی بہت اچھی جانتے ہیں۔" اور اسی دن جب ہم دونوں کالج سے واپس اپنے گھر آرہے تھے تو چوکی رڑڑ کے پاس مولانا شمس نوید عثمانی صاحب پشت سے نظر آئے۔ ہم احتراماً سائیکلوں سے اتر گئے، سلام علیک ہوئی اور وہ اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ مولانا چھت پر گئے اور فوراً ہی واپس آکر اوپری سیڑھی سے پکارا نسیم میاں اوپر آجایئے۔ ہم دونوں چھت پر گئے۔ تقریباً پچاس مربع گز کی اس چھت پر جنوبی سمت میں دو کمرے تھے۔ بائیں جانب بڑا کمرہ تھا اور دائیں جانب چھوٹا کمرہ جو عموماً ہمارے گھروں میں اسٹور روم کے طور پر بنایا جاتا تھا۔ لیکن شمس نوید صاحب نے اسے ریڈنگ روم بنالیا تھا۔ الماریوں میں بہت سی کتابیں تھیں۔ ایک چھوٹی میز اور تین چار کرسیاں۔ وہ اسی کمرے میں ہمیں بھی بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئے۔ "لایئے کیا پڑھیں گے؟ انھوں نے پوچھا۔ میرے پاس انگلش گرامر کی کتاب تھی۔ میں نے وہی ان کے آگے رکھ دی۔ مولانا نے کچھ سوالات کرکے ہماری انگلش کی لیاقت کا جائزہ لیا اور گرامر پڑھانے سے آغاز کیا۔ تقریباً سوا گھنٹے وہ بڑی دلچسپی سے پڑھاتے رہے۔ پھر میں نے کہا۔ " محترم آج اتنا ہی کافی ہے۔ اسے یاد بھی تو رکھنا ہے۔" اور انھوں نے مسکرا کر کہا "تو آپ تھک گئے؟ "میں نے کہا" نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ سوا دو بج رہے ہیں۔ آپ کو کھانا بھی کھانا ہو گا۔" مولانا نے جو فرمایا وہ کوئی ٹیوٹر یا ٹیچر کا جواب نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ تھا کہ کھانا کھانا تو روزانہ کا عمل ہے۔ اگر اس وقت نہ

کھائیں یا دیر سے کھالیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر امتحان روز روز نہیں ہوتا۔ اس لیے امتحان کی اہمیت زیادہ ہے۔ مولانا کے اس تجزیے کے بعد کچھ کہنے کی ہمّت نہیں ہوئی اور انھوں نے خود ہی فرمایا کل دس بجے آجایئے تب زیادہ دیر بیٹھیں گے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ہمیں خود بھی بھوک بری طرح ستا رہی تھی اور یہ احساس بھی تھا کہ والدہ منتظر ہوں گی اور تاخیر ہو جانے کی وجہ سے پریشان ہوں گی۔ انھیں ہمارے اس پروگرام کا علم کہاں تھا۔

مولانا محترم ہمارے ساتھ ہی چھت سے اتر آئے اور مکان سے متصل مسجد میں ظہر کی نماز کے لیے رخصت ہوگئے اور ہم اپنے اپنے گھر چلے آئے۔

اگلے دن سے مولانا نے کئی کئی گھنٹے ہمیں دیئے۔ جب ہم سننے اور سمجھنے کے دماغ کو بوجھل محسوس کرنے لگتے تو وہ ہماری حرکات وسکنات سے پہچان لیتے اور کتاب بند کر کے گفتگو کرنے لگتے۔ دینی موضوعات پر بولتے ہوئے اسلام کی عظمت و اہمیت کو ہمارے ذہنوں میں بٹھاتے۔ اچھے مسلمان کی خوبیاں بتاتے۔ ایک دن مولانا نے الماری سے ایک ضخیم کتاب نکالی۔ یہ کتاب مختلف ممالک میں عیسائیوں کے قبولِ اسلام سے متعلق تھی۔ ہر نو مسلم کا فوٹو بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ کتنوں ہی کے قبول اسلام کا سبب پڑھ کر بتاتے رہے۔ ہم جب تازہ دم ہوئے تو سلسلہ تدریس پھر شروع کر دیا۔ آٹھ دس دن میں ہماری انگلش کی استعداد میں اس قدر اضافہ فرمادیا کہ ہم پورے اعتماد سے امتحان کا پرچہ حل کر سکتے تھے۔ اور

ہوا بھی ایسا ہم انگلش میں اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ غالباً شمس نوید عثمانی صاحب کی اہلیہ اگرچہ برابر کمرے میں ہوتی تھیں مگر کسی قسم کی کوئی آواز ہم نے نہیں سنی۔ ہمیں تو یہ احساس اس دن ہوا جب ایک دوبار مولانا نے سہ پہر میں ہمارے لیے چائے بنوائی اور پھر خود ہی ٹرے لاکر ہمارے سامنے رکھ دی۔ کمرے کا دروازہ ایسے ہی موقع پر کچھ دیر کے لیے بند کیا۔ کچن کمرے کے سامنے زینے کے ٹنکی پر بنا ہوا تھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ مولانا نے ان دنوں دوپہر کا کھانا کھایا ہوگا۔ مولانا کی یہ شفقت، محبت اور حسنِ سلوک محض فی سبیل اللہ تھا۔ کہاں ملے گی اس جیسی کوئی دوسری مثال؟

مولانا شمس نوید عثمانی نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اقامت دین اور دعوت و تبلیغ دین میں لگایا۔ ان کے وسائل محدود تھے۔ ان کی دعوت و تبلیغ کا انداز بھی دوسری تنظیموں اور تحریکوں سے مختلف تھا۔ انکی دعوت کا ہدف دینِ حق سے ناواقف اور محروم قوم تھی۔ کچھ جماعتوں اور افراد نے ان کی اس کوشش کو تنقید کا ہدف بھی بنایا لیکن میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی سوچ انتہائی مخلصانہ تھی جس پر وہ اعتراضات کی پرواہ کیے بغیر مہلتِ عمر کے آخر تک کام کرتے رہے۔
بہر حال مولانا شمس نوید عثمانیؒ ایک خدا ترس، داعئ دین، خوش اخلاق اور منکسر المزاج انسان تھے۔ خوف آخرت ہمیشہ دامن گیر رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ انکی دینی کوششوں کو قبول فرمائے اور آخرت میں انعامات سے نوازے۔ آمین۔

معلم بھی، کردار ساز بھی

ڈاکٹر محمد اقبال خاں
(شہر رام پور کے ایک بہت سینئر ٹیچر)

میں نے ۱۹۶۵ میں مدرسہ عالیہ رام پور میں چھٹی جماعت میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۷ تک میں نے وہاں پر تعلیم حاصل کی۔ میں ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے شمس نوید صاحب سے تعلیم حاصل کی۔ وہ ہمیں ہسٹری اور جغرافیہ پڑھاتے تھے اور ان کی نصیحتوں اور تعلیم کے انوکھے انداز نے میری زندگی کو بے حد متاثر کیا۔ کچھ خاص یادوں کا ذکر کرنا چاہوں گا:

- ایک مرتبہ میں ۷/ویں کلاس میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا، تبھی شمس صاحب کے پیریڈ کی باری آئی — انھوں نے سب سے پہلے مجھ سے پوچھا — "اقبال! کیا تم نے فجر کی نماز ادا کرلی ہے؟" میں نے نہیں میں جواب دیا تو انھوں نے کہا: "جاؤ، پان دریبہ والی مسجد میں نماز پڑھ کر آؤ۔ پھر کلاس میں بیٹھنا!" میں نے نماز پڑھی اور پھر کلاس میں آیا، اس کے بعد الحمدللہ میری نماز بہت ہی کم قضا ہوئی۔
- ایک بار کلاس میں ہسٹری پڑھا رہے تھے طائف کے ظلم کی داستان بیان کرنے لگے۔ جیسے جیسے آگے بڑھے ان پر رقت طاری ہوتی گئی۔ سرورِ کونین ﷺ پر انکار کرنے والوں نے جو پتھروں کی شدید بارش کی تھی اور آپؐ کی

نعلین مبارک خون سے بھر گئیں تھیں، اس کو سناتے جاتے تھے اور آنسو گرتے جاتے تھے۔ ایسی زندہ تصویر پیش کی کہ ان کے ساتھ پوری کلاس کے بچے بھی رونے لگے۔ میں نے بہت سے مواقع پر انھیں روتے ہوئے دیکھا ہے۔ خالی وقت میں وہ ہمیشہ لائبریری میں لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔

- ایک مرتبہ میں نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مدرسہ کہنہ کی ایک مسجد میں وعظ کا پروگرام رکھا جس میں مولانا شمس نوید صاحب اور مولانا یوسف اصلاحی صاحب کو مدعو کیا۔ میں نے شمس صاحب کے رکشہ سے آنے پر کرایہ دینے کی کوشش کی تو انھوں نے منع کردیا (آجکل اس کے برعکس ہے۔) پروگرام کے بعد مہمانوں کے لیے کچھ چائے، ناشتہ کا انتظام تھا لیکن انھوں نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ "مجھ سے چائے کی ایک پیالی اور مٹھائی سے میرا ثواب خریدنا چاہتے ہو!" اس کے بعد انھوں نے مجھ سے گھر پر آکر ایک مہمان کے طور پر چائے پینے کا وعدہ کیا۔
- ایک دن میں ان کے ساتھ ساتھ سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ سڑک کی دوسری جانب ایک تین منزلہ عمارت بن رہی تھی، مجھ سے بولے — "اقبال! اس عمارت کا مالک اپنے لیے اینٹیں اور پتھر آسمان پر چڑھوا رہا ہے اور اسے خود اپنے پل بھر کا پتہ نہیں ہے!"
- ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھلی رہتی تھی اور جب کبھی کسی بچے سے ناراض ہوتے تو کان کے نیچے کا حصہ ہلکے سے چٹکی سے پکڑ کر نصیحت کرنے لگتے

تھے — مجھ سے خاص طور پر محبت کرتے تھے اور انھیں کی بدولت میری زندگی میں دین داخل ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے میں ان کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

شاہد بلال

(تاجر۔ مولینا کے مدرسہ عالیہ کے شاگرد)

سبھی طلبہ مولینا شمس نوید عثمانیؒ سے محبت کرتے تھے لیکن میں تو ان کا مرید تھا۔ وہ استاد تھے اور میرے مرشد لیکن جب بھی کبھی ہم دونوں نماز میں اکیلے ہوتے وہ ہمیشہ مجھے آگے کر دیتے تھے اور میری امامت میں نماز ادا کرتے تھے۔ مجھے ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

بدھ کے دن بازار بند ہوتا تھا، لہٰذا میں ہر بدھ کو عصر کی نماز ان کے گھر کے پاس والی مسجد میں ادا کرتا تھا جہاں وہ نماز پڑھتے تھے۔ مسجد کے امام صاحب کو نہ معلوم کیوں ان سے کدورت تھی۔ میں اسے واضح محسوس کرتا تھا تو ظاہر ہے کہ روزانہ کے نمازی بھی اسے سمجھتے ہوں گے لیکن حضرتؒ ہمیشہ انہیں کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے۔ معلوم نہیں یہ ان کی سادگی تھی جو انہیں امام صاحب کا رویہ نظر نہیں آتا تھا یا ان کا بے پناہ تحمل جو کبھی کسی کو ان کے رویہ میں ناگواری کا احساس نہیں ہونے دیتا تھا۔

ایک دن میں ان کے ساتھ مسجد پہنچا تو جماعت کا وقت ہو گیا تھا لیکن امام صاحب کو کچھ تاخیر ہو گئی تھی۔ نمازیوں نے اصرار کر کے حضرت کو امام کی جگہ کھڑا کر دیا۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آج حضرت کے پیچھے نماز پڑھنے کا موقع مل رہا تھا۔ میرا وضو نہیں تھا۔ میں وضو کرنے کے لیے دوڑا تاکہ جلدی سے وضو کر کے نماز میں شامل ہو سکوں۔ ابھی وضو سے فارغ ہوا ہی تھا کہ میں نے امام صاحب کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا۔ امام صاحب یہ دیکھنے کے لیے ذرا اندر تک آگے بڑھے کہ امامت کون کر رہا ہے اور جیسے ہی ان کی نظر حضرت پر پڑی وہ الٹے پاؤں واپس ہوئے، اپنی چپلیں اٹھائیں اور مسجد سے باہر نکل گئے۔ میں نے یہ سب ماجرا اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

نماز کے بعد جب میں حضرت کے ساتھ ان کے گھر پہنچا تو میں نے ان سے کہا کہ آج دو باتیں ہوئیں۔ ایک بہت خوشی کی ہے اور ایک ذرا تشویش کی۔ حضرت نے کہا کہ تمہاری خوشی کی بات تو میں سمجھ سکتا ہوں لیکن تشویش کی بات کیا ہے؟ میں نے امام صاحب کی حرکت کے بارے میں بتایا تو میں نے دیکھا کہ ان کا چہرہ ناراضگی سے سرخ ہو گیا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ بالآخر حضرت کو امام صاحب کی کدورت کا احساس ہو ہی گیا اور اب وہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے جس کے نصیب میں نماز نہیں تھی اس نے نہیں پڑھی، میرا اس میں کیا قصور ہے؟ لیکن جب انہوں نے زبان کھولی تو میں سہم گیا۔ ان کی آواز سخت تھی اور انہوں نے مجھے ڈانٹ کر کہا، شاہد بلال تم نے بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ تم نے ایک شریف انسان سے بدگمانی

کی۔ تم یہ بھی تو سوچ سکتے تھے کہ انہیں اچانک کوئی انتہائی سخت ضرورت پیش آگئی ہو، اس لیے وہ اس وقت مسجد سے چلے گئے ہوں۔ تم ابھی اپنے گناہ پر توبہ کرو اور استغفار کرو۔ اس روز حقیقتاً میری سمجھ میں آیا کہ تقویٰ کسے کہتے ہیں اور متقی کیسے ہوتے ہیں۔

ایک دن میں مغرب کی نماز کے کچھ دیر بعد پہنچا۔ مجھے معلوم تھا وہ مسجد میں ہوں گے۔ وہ مغرب کے بعد نماز اوّابین کے علاوہ بھی کچھ نفل نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ حضرت اپنے مخصوص کونے میں ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور ہزاروں مچھروں کا ایک غول ان کے اوپر منڈلا رہا تھا۔ بہت سے مچھر ان کے چہرے، ہاتھ اور پاؤں پر چمٹے ہوئے تھے لیکن وہ اس سے بے نیاز ایسے مستغرق تھے کہ انہیں مچھروں کے کاٹنے کا احساس ہی نہیں تھا۔ حضرت کو تنہائی میں نماز پڑھتے جنہوں نے دیکھا ہے، صرف وہی نماز میں ان کے شغف کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں نے ایک کپڑا اٹھا کر مچھر اڑائے اور سلام پھیرنے تک ان کے پیچھے کھڑا مچھر ہٹاتا رہا۔

تقوے کو الفاظ میں سمجھنا مشکل ہے۔ جن خوش نصیبوں نے کسی متقی کو قریب سے دیکھا ہے وہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے جسے سمجھنے کے لیے تھیوری کے ساتھ پریکٹکل دیکھنا بھی ضروری ہے۔ بد قسمتی سے اب وہ لوگ کہیں نظر نہیں آتے جنہیں دیکھ کر تقوے کو سمجھا جا سکے۔

ایک حقیقی معلم — میرے استاد محترم

مجیب رضا خاں (ٹیچر)

وہ عمر کا ابتدائی دور تھا۔ ۱۹۷۵ء میں میرا داخلہ مدرسہ عالیہ میں ۷ ویں درجہ میں کرایا گیا تھا۔ پہلے دن جب جغرافیہ کا کلاس تھا، تو کمرے میں ایک پرزور اور باوقار شخصیت داخل ہوئی۔ چہرے پر نظر پڑی تو دل کی کیفیت ہی بدل گئی۔ وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ میرے نئے استادِ محترم شمس نوید عثمانی صاحبؒ تھے۔

بے شک ہدایت اللہ دیتا ہے، لیکن ایک اچھا معلم اس راہِ ہدایت تک رسائی کو آسان کر دیتا ہے۔ آج میں سوچتا ہوں کہ اگر عمر کے اس دور میں شمس صاحب جیسا معلم نہ ملا ہوتا تو نمازوں میں وہ خشوع، خضوع اور پابندی نہ ہوتی جو ان کی کاوشوں سے پیدا ہوئی تھی۔ اصلاح کا عجیب و غریب انداز تھا۔ پڑھائی شروع کرنے سے قبل نماز کی بات ہوتی۔ آج کتنی نمازیں ادا کی گئیں؟ اس بنیاد پر اسٹار دیے جاتے، جتنی نمازیں اتنے اسٹار۔ اس سے طالب علموں میں مقابلہ آرائی کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور اگلے دن سبھی کی نمازیں پوری ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ چالیس دن چلا اور الحمدللہ چالیس دن بعد تقریباً سبھی طالب علم نمازوں کے پابند ہو گئے تھے اور اس کے اثرات آج بھی ہماری زندگی پر ہیں۔

سمجھانے اور ہدایت کرنے کا انداز منفرد تھا۔ ایک مرتبہ ہاتھوں میں گلاب لے

کر کلاس میں داخل ہوئے اور ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا: "ان پھولوں کی طرح بنو جو ہاتھوں سے مسلے جاتے ہیں اور پیروں تلے روندے جاتے ہیں، پھر بھی مسکراتے رہتے ہیں اور خوشبو بھی بکھیرتے رہتے ہیں۔"

☆☆☆

یادوں کے دریچے سے۔۔۔

مولینا کے پاسپورٹ کی انکوائری کا واقعہ میرے اسی کتاب کے مضمون میں درج ہے۔ اُس سال حضرت حج کے لیے نہیں جا سکے تھے۔ اگلے سال پھر درخواست دی، پھر دو پولس مین انکوائری کے لیے آئے۔ اس بار وہ جانتے تھے کہ یہاں سے کچھ ملے گا نہیں۔ مولینا نیچے اترے تو انہوں نے فوراً ایک نفسیاتی وار کیا۔ پہلا ہی سوال تھا، "سنا ہے تمہارے گھر پر ہتھیار ہیں؟" "ہاں بہت ہیں، آؤ دکھاؤں"، یہ کہہ کر مولینا زینے سے اوپر چلے گئے۔ سپاہی نہتّے تھے، بہت ڈر گئے۔ بہت محتاط ہو کر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے وہ اوپر پہنچے۔ مولینا انہیں کمرے میں لے گئے۔ کہا، "دیکھو یہ اِدھر قرآن پاک کی تفسیریں ہیں، یہ وید رکھے ہیں، وہ اُدھر بائبل کے نسخے ہیں، اُس طرف اوپر گرنتھ صاحب اور ادھر۔۔۔"

مولینا نے یہ سب دکھا کر چیلنج کیا، "یہ میرے ہتھیاروں کا ذخیرہ ہے۔ لڑ سکو گے تم مجھ سے؟"

وہ دونوں تھر تھر کانپنے لگے اور پاؤں چھونے کے لیے چرنوں میں جھک گئے۔ اس سال مولینا کا پاسپورٹ بن گیا تھا۔ (سیّد عبداللہ طارق)

نعتِ رسولِ پاک ﷺ

شمس نوید

(مولینا نے اپنی منہ بولی بہن مرحومہ ملک صفیہ کو ایک نوٹ بک پر یہ نعت لکھ کر دی تھی)

جو پڑھے درود دل سے وہ زباں کہاں سے لاؤں؟
ترے شکریہ کے قابل دل وجاں کہاں سے لاؤں؟
ترے دن تری نگاہیں، تری شب تری کراہیں
وہ جنھیں ترس گیا ہے یہ جہاں، کہاں سے لاؤں؟
ہے زمینِ کشتِ جنت پہ محیطِ ظلمِ طائف
ترے پائے خوں چکاں کے وہ نشاں کہاں سے لاؤں؟
یہ ہزار پارہ پارہ ترا دین تیری امت
جو بکھر گئی ہے جنت وہ کہاں کہاں سے لاؤں؟
وہ سمیہؓ و عمارہؓ کا وضو خود اپنے خوں سے
میں بلالِ آبلہ پا کی وہ اذاں کہاں سے لاؤں؟
کبھی دوستوں کو دھونا● کبھی دشمنوں پہ رونا●●
جو وہاں تھا رنگِ محفل وہ یہاں کہاں سے لاؤں؟

☆☆☆

● مفہوم حدیث: دو مومن بھائی دو ہاتھوں کی مانند ہیں جیسے ایک ہاتھ دوسرے کو دھوتا ہے۔

●● مفہوم قرآن سورۃ الشعراء (۲۶) آیت ۳

مادر مہربان۔ چچیؒ جان

(اہلیہ مولانا شمس نوید عثمانیؒ)

کچھ خواتین کے تاثرات

ڈاکٹر شمع طارق: خود غریب تھیں، لیکن بلا کی غریب پرور تھیں

وہ رشتہ میں مولانا شمس نوید عثمانیؒ کی سگی چچازاد بہن تھیں۔ دین داری اور علم اُنہیں ورثہ میں ملا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ان کے چچا تھے، مفتی عتیق الرحمان عثمانی چچازاد بھائی اور مولانا عامر عثمانی سگے بڑے بھائی تھے۔ ان کو ہم سب چھوٹے بڑے چچی جان کے نام سے پکارتے تھے۔

میری والدہ اور خالہ سے ان کا بہت قریبی تعلق تھا۔ یہ تعلق دوستی کا بھی تھا اور دینی بھی۔ چچی جان ہماری نانی کے گھر مستقل آتی رہتی تھیں۔ جگہ جگہ اجتماعات میں سب ساتھ جاتی تھیں۔ درس قرآن میری خالہ احمدی خاتون (اپیا) سابق پرنسپل جامعہ الصالحات دیتی تھیں اور درس حدیث چچی جان دیتی تھیں جو خواتین

میں بہت مقبول تھا۔ ہر پیر کو غنیمت آپا کے گھر ان کا اجتماع ہوتا تھا۔ اس اجتماع کی کامیابی کی دلیل یہ ہے کہ یہ چچی جان کی معذوری کی عمر تک تقریباً ۴۰ سال پابندی سے جاری رہا۔ اگر کبھی غنیمت آپا اور ان کے گھر والے پیر کے روز شہر سے باہر بھی ہوتے تھے تو گھر کی چابی دے کر جاتے تھے کہ یہ سلسلہ نہ ٹوٹے۔ اس کے علاوہ بھی جگہ جگہ مختلف دنوں میں ان کے دینی اجتماعات رہا کرتے تھے۔ جو سبھی بہت مقبول تھے۔

مولانا شمس نوید عثمانیؒ کی حیات میں بھی اور ان کے بعد بھی بہت معمولی پنشن پر ان کا گزارا تھا۔ ایک اسکول ٹیچر جس نے قبل از وقت ریٹائر منٹ لے لیا ہو اس کی پنشن ہی کتنی ہوتی ہے! وہ غریب تھیں لیکن پھر بھی بلا کی غریب پرور تھیں۔ ضرورت مند خواتین اکثر ان کے پاس جمع رہتی تھیں۔ جو ان سے اپنی ضرورت بیان کرتا اس کی خاموشی سے مدد کر دیا کرتی تھیں لیکن اگر ان کی استطاعت سے زیادہ ہوتا تو اجتماع کے بعد اکثر اپیل کرتی تھیں اور ضرورت مند کے لئے کافی رقم اکٹھی ہو جاتی تھی۔ ان کے اس مزاج کا ناجائز فائدہ اٹھانے والی بھی بہت تھیں جو ان سے کافی رقم اینٹھتی رہتی تھیں۔ بعض تو ان میں وہ ہوتی تھیں جن کے گھر کے سامان کا عشر عشیر بھی چچی جان کے گھر نہ تھا۔ اپنے پیسے آخر عمر میں میرے پاس رکھتی تھیں پھر جس کو دینے ہوتے تھے اس کو پرچہ لکھ کر دیتی تھیں۔ بہت ذہین خاتون تھیں۔

اگر کسی کے درمیان اختلافات کی ان کو خبر ملتی تھی تو اس کے گھر جاکر مصالحت کرواتی تھیں۔ بہت متقی خاتون تھیں اکثر عبادات میں مشغول رہتی تھیں۔ پنج سورہ اور تسبیحات معمول تھے۔

چچی جان پردے کی پابندی میں بہت سخت تھیں اور جہاں جاتیں وہاں معمولی بے احتیاطی کی بھی انہیں برداشت نہ تھی۔ مجھ سے خاص طور پر بہت محبت کرتی تھیں۔ میرے شوہر طارق صاحب کو اپنا بیٹا کہتی تھیں اور مجھے اپنی بیٹی۔ بڑھاپے کی عمر کی وجہ سے مولٰینا نے بھی انہیں طارق صاحب سے پردہ نہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی لیکن انہوں نے اس رخصت کا استعمال نہیں کیا۔ مولٰینا کے انتقال کے بعد جب بہت معذوری بڑھ گئی تبھی ضرورتاً ان کے پردے میں رعایت ہوئی۔ پردہ ہی نہیں، کسی بھی خلاف شرع بات کی ان میں برداشت نہیں تھی۔ بہت صاف گو تھیں۔ فوراً ٹوک دیا کرتی تھیں۔ چاہے عام زندگی کے معاملات ہوں یا شادی بیاہ کی رسومات، نہی عن المنکر میں وہ بالکل رعایت نہیں کرتی تھیں۔ سب ڈرتے تھے کہ چچی جان آرہی ہیں، فلاں بات پر ڈانٹیں گی۔

حضرت مولٰینا کی معمولی پنشن پر گزر اوقات تھی لیکن انہیں تحائف دینے کا بہت شوق تھا۔ جب دیوبند جاتیں تو اکثر لوگوں کے لئے تحفے لیکر آتی تھیں۔ باقی سب بھی ان سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کو تحائف دیتے تھے جنہیں قدردانی میں وہ سب کو دکھایا کرتی تھیں۔

مولینا اپنے دو بوسیدہ سے کمروں میں رہتے تھے۔ اور جمعہ کے دن صبح کو ان کا درس قرآن ہوتا تھا۔ میں بھی ہمیشہ جمعہ کی صبح کو چچی جان کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ ایک کمرے میں مرد حضرات ہوتے تھے اور دوسرا کمرہ زنانہ تھا۔ دونوں کمروں کے درمیان ایک بغیر کواڑ کا پتلا دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا رہتا تھا اور میں اس سے لگ کر بیٹھ جاتی تھی درس سننے کے لئے۔ وہ درس کے دوران ہی ناشتہ اٹھا لاتی تھیں اور کوئی پھل ہوتا تو اس کو بھی کاٹ لیتی تھیں۔ زیادہ تر ہم دو ہی ہوتے تھے۔ کبھی کبھی دو ایک خواتین اور بھی آجاتی تھیں۔ ان میں سے اکثر سے کہتیں کہ یہ میری بہو بھی ہے بیٹی بھی۔ اکثر مجھ سے پوچھتی تھیں کہ طارق تم کو ٹائم بھی دیتے ہیں یا نہیں؟ کبھی کہتی تھیں تمہارا خیال رکھتے ہیں یا نہیں؟ چچی جان بہت مہمان نواز تھیں۔ مولینا کے انتقال کے بعد تنہا رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی ساتھ رہنے کے لئے چند روز کو مل جاتا تھا لیکن اپنی شدید بیماری کے دنوں میں بھی بیڈ کے پاس الماری میں مستقل پلاسٹک کے ڈبوں میں تواضع کا سامان رہتا تھا۔ جو مہمان آتا اس کو فوراً پیش کرتیں اور اصرار کر کے کھلاتی تھیں۔

حافظہ کا یہ عالم تھا کہ ہم بھول جاتے تھے لیکن ان کو سب یاد رہتا تھا۔ اجتماع میں شریک خواتین کے نام، ان کے رشتہ دار اور ہمارے سارے ملنے والوں کے نام آخر عمر تک انہیں یاد تھے۔ سب کے نام لے کر ان کی خیریت پوچھتی رہتی تھیں۔ چاہے کسی سے کافی عرصہ پہلے ایک ہی ملاقات کیوں نہ ہوئی ہو۔ ملاقات کی ہر تفصیل انہیں یاد رہتی تھی۔ ایک مرتبہ چند دن ہمارے گھر رکیں۔ باہری

کمرے میں واش روم قریب ہونے کی وجہ سے ان کو رکوایا تھا۔ وہ چل نہیں پاتی تھیں گود میں لیکر ان کو لایا گیا تھا۔ لیکن جب میں کلینک سے آکر ان کے پاس جاتی تو پورے گھر کی ہر چھوٹی سے چھوٹی بات مجھ کو بتاتی تھیں۔ بار بار مجھ سے کہتی تھیں کہ اتنا کام نہ کیا کرو، آرام بھی کیا کرو۔

مولینا ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ انہوں نے ایک نظم چچی جان کے نام لکھی تھی، زبردست دل کو چھونے والی جس میں ہر بند کے آخر میں یہ مصرعہ آتا تھا:
"مری شریک زندگی ہمارا گھر یہاں نہیں!"

ان کے انتقال کے بعد ان کو غسل دینے کی سعادت بھی مجھ کو ملی اور اتفاق یہ کہ ان کی قبر کے لئے جو جگہ ملی وہ میری والدہ کی آرام گاہ کی بغل میں ہے۔

جانے والے چلے جاتے ہیں۔ یادیں کچھ دنوں میں مضمحل ہو جاتی ہیں۔ لیکن کچھ لوگ تاریخ کے ان اوراق میں درج ہو جاتے ہیں جنہیں بار بار پلٹا اور کھولا جاتا ہے۔ حضرت مولینا شمس نوید عثمانیؒ انہیں میں سے ایک تھے لیکن ہر کامیاب مرد حتٰی کہ انبیاء علیہم السلام کی کامیابیوں میں بھی ان کی کسی والدہ، کسی زوجہ یا کسی صاحب زادی کا حصہ ضرور رہا ہے۔ حضرت مولیناؒ کا نام بھی جب جب آئے گا تو ان کے برابر ان کی غمگسار اور ان کی مددگار چچی جان کا نام بھی لکھا ہوگا۔

اسما جاوید: مشن کے نوجوان اور ان کی بیویاں ہی ہماری اولادیں ہیں!

چچی جان سے میرا تعلق تبھی سے ہے جب سے میرے شوہر جاوید انجم صاحب کی مولینا شمس نوید عثمانیؒ سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ غالباً ۱۹۸۹ کی بات ہے، جب میری بڑی بچی گود میں تھی۔ ان سے مل کر مجھے پہلی مرتبہ ایسا لگا کہ ماں جیسی ممتا کہیں اور بھی مل سکتی ہے۔ جیسے ماں اپنے بچوں کی تکلیفوں کو سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتی ہے اور انھیں حفاظت کا محفوظ دائرہ عطا کرتی ہے، ایسی ہی کچھ شخصیت ہماری چچی جان کی تھی۔ وہ ہماری دوسری امی تھیں اور آخر کیوں نہ ہوتیں؟ وہ ایک ایسی شخصیت کی شریک حیات تھیں جس کا نام مستقبل کی تاریخ کے صفحات میں سنہری الفاظ میں لکھا جانا تھا اور جو ایک انقلاب کی پیش گوئی کرنے والا اور اس کو عملی جامہ پہنانے والا تھا۔

میری امی زرینہ بیگم بھی چونکہ ایک دیندار اور داعی صفت خاتون تھیں اور ان کے اجتماع کو سننے کے لئے ایک بڑی تعداد میں خواتین آیا کرتی تھیں۔ میں نے چچی جان سے انکی ملاقات کروائی تو بے حد خوش ہوئیں اور پھر دونوں مل کر ایک بزرگ خاتون غنیمت آپا کے گھر عورتوں کے اجتماع کا پروگرام رکھتی تھیں جس میں درس قرآن بھی شامل تھا۔ عورتوں پر اس کا بڑا اچھا اثر ہوتا تھا۔ چچی جان سے جب لوگ ان کی اپنی اولاد نہ ہونے کا ذکر کرتے تو وہ فرماتی تھیں، یہ نوجوان لڑکے اور ان کی بیویاں ہی ہماری اولادیں ہیں۔ آخر جس کے اتنے بیٹے اور بیٹیاں

ہوں، اسے اولاد نہ ہونے کا کیا شکوہ! وہ ہمیں مطالعہ کے لئے نئی نئی دینی کتابیں دیا کرتی تھیں اور گھر جانے پر کھانا کھلائے بغیر نہیں چھوڑتی تھیں۔

ان میں ایک حیرت انگیز صفت یہ تھی کہ وہ چہرا دیکھ کر ہماری گھریلو پریشانیوں کا اندازہ لگالیا کرتی تھیں اور ہمیں بھی اپنے مسائل ان کے آگے رکھنے میں سکون ملتا تھا۔ عید کے موقع پر بے حد خاطر داری کیا کرتی تھیں اور ہمارے بچوں کو عیدی ضرور دیتی تھیں۔ لوگوں کی ضرورتیں خود بھی پوری کرتی تھیں اور اپنے جاننے والوں سے کہہ کر بھی ضرورت مندوں کی حاجتیں پوری کرواتی تھیں۔ نہ جانے کتنے گھروں کو ان سے آس لگی رہتی تھی۔ کچھ دن قبل ہی ان کی ایک پڑوسن نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ میری بچی کی شادی ہے اور میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے! اگر چچی جان حیات ہوتیں تو مجھے کوئی فکر نہ ہوتی، وہی سب انتظام کرواتیں! شوہر اور بیوی میں جھگڑا ہونے پر دونوں کو اس طرح سمجھاتی تھیں کہ بہت سے مسائل حل ہو جاتے تھے۔

وہ اپنی تقریروں میں جادو ٹونے اور توہمات کے خلاف بولتی تھیں۔ وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ تم لوگ اپنے بیٹوں کو سمجھایا کرو کہ وہ اپنی بہنوں کا خیال رکھیں اور ان کے حقوق ادا کریں۔ خاندان کے افراد سے مراسم بنا کر رکھیں اور ان کے بارے میں اللہ سے ڈریں۔ وہ ہر جمعہ کو صلوۃ التسبیح ضرور پڑھتی تھیں اور بہت بیمار ہونے پر بھی روزے نہیں چھوڑتی تھیں۔

۲۰۱۴ میں میری امّی کے انتقال کے تقریباً ۶ مہینہ بعد ہماری دوسری امّی یعنی ہماری روحانی ماں چچی جان بھی اس دارِفانی سے رخصت ہو گئیں اور اپنے پیچھے چھوڑ گئیں ایسی خوشنما یادیں جو آج بھی ہمارے ساتھ زندہ ہیں۔

پروین شاکر: خدیجہ باجی سے 'ماں' بننے تک کا سفر

چچی جان سے میری پہلی ملاقات ایک اتفاق ہی تھی۔ میرے گھر خواتین کا سہ روزہ اجتماع ہوتا تھا۔ جس میں سنبھل سے آنے والے بہت سے لوگوں کے علاوہ دیوبند کی اقلیم فاطمہ بھی تھیں۔ انھوں نے مجھ سے خدیجہ باجی کا ذکر کیا اور اجتماع میں بلانے کا اصرار کیا۔ خدیجہ باجی (چچی جان) کے شوہر مولانا شمس نوید عثمانیؒ کا نام میں نے اپنے شوہر سے پہلے ہی سُن رکھا تھا اور میرے شوہر شاکر خاں صاحب ان کے ہفتہ وار درس میں جایا کرتے تھے۔

خدیجہ باجی سے ملنے کی تمنّا مجھے ان کی رہائش گاہ تک کھینچ لے گئی۔ اقلیم فاطمہ نے میرا ان سے تعارف کرایا تو وہ بے حد خوش ہوئیں اور میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے اجتماع میں آنے کا وعدہ کیا۔ اجتماع میں اس دن بہت بڑی تعداد میں سنبھل اور رامپور کی خواتین شامل تھیں۔ بڑی تعداد دیکھ کر خدیجہ باجی بے حد خوش ہوئیں اور ان کی اپنائیت اور اخلاص نے مجھے بہت متاثر کیا۔ اس طرح ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور گھر آنا جانا بھی ہوتا رہا۔ میں جب بھی ان کے گھر جاتی، کھانا کھلا

ۓ بغیر نہیں چھوڑتی تھیں اور میرے لئے کھانے کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ وہ مجھ سے بے حد لگاؤ رکھتی تھیں اور مجھے اپنی بیٹی بنالیا تھا۔ اور جن شناسا خواتین سے ان کی ملاقات ہوتی تھی تو وہ میرا تعارف بیٹی کے طور پر کرایا کرتی تھیں۔ میرے لیے بھی وہ ایک ماں سے کم نہیں تھیں۔ ان کا جب دل چاہتا وہ میرے گھر آجایا کرتی تھیں۔ سیما کے دیوبند چلے جانے پر ہفتہ دس دن میرے یہاں قیام کرتی تھیں۔

خدیجہ باجی سے میری ملاقات چونکہ شمس نوید عثمانیؒ کے انتقال کے بعد ہوئی تھی، اس لئے ایک مرتبہ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ رام پور میں اکیلے کیسے رہ پائیں؟ اس پر انھوں نے بتایا کہ شمس صاحب کی دو بھانجیاں عطیہ اور سیما ان کے ساتھ ہی رام پور میں رہتی تھیں۔ عطیہ کی شادی کے بعد سیما میری دیکھ بھال کرتی تھیں۔ طارق جو شمس صاحب کی دعوتی تحریک کی نمائندگی کرتے ہیں، انھوں نے ایک بیٹے کی طرح میری دیکھ بھال کی ذمہ داری لے لی۔ میں دیوبند نہ جاکر رامپور میں ہی رک گئی اور تحریک سے جڑے ہوئے سبھی لوگ میری دیکھ بھال کرتے ہیں۔ طارق نے اپنی محنت اور صلاحیتوں سے تحریک میں ایک نئی جان پھونک دی۔ درسِ قرآن کا سلسلہ بھی میرے گھر پہلے کی طرح چلتا رہا۔

چچی جان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنی دوستوں اور رشتہ داروں کو تحائف دیا کرتی تھیں۔ میرے گھر کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتی تھیں، کبھی کوئی

اچھا سوٹ نظر آتا تو میرے لئے خرید لیا کرتی تھیں ،اور بڑی محبت سے مجھے دیا کرتی تھیں۔ جب کوئی نیا کپڑا یا نیا جوتا پہنتیں تو سب سے پہلے دو رکعت نماز پڑھتی تھیں اور اللہ کی بار گاہ میں شکرانہ ادا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ یہ سب میں نے تمہارے چچا جان سے سیکھا ہے۔

چچی جان، مولانا کے قصے بہت خوش ہو کر سناتی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ شمس صاحب جتنی مرتبہ گھر میں داخل ہوتے، سلام کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان سے کہتی کہ آپ بار بار سلام کیوں کرتے ہیں؟ میں ہی تو گھر میں اکیلی ہوں! وہ کہتے کہ خدیجہ! تم بھی بار بار جواب دیا کرو۔ ہم ایک دوسرے کے لئے سلامتی کی دعا کیا کرتے ہیں، کتنی اچھی سنت ہے؟ اس پر عمل کرنے کے بہت سے فائدے ہیں!

ایک مرتبہ چچی جان کے گلے میں ٹانسل پک جانے پر بے حد تکلیف تھی، ڈاکٹر نے آپریشن کا مشورہ دیا تو چچی جان گھبرا گئیں۔ مولانا کے سمجھانے پر وہ مان گئیں، انھیں شمس صاحب پر بہت بھروسہ تھا۔ آپریشن کی تاریخ طے ہوگئی۔ گھر آکر مولانا مسجد گئے اور دو رکعت نفل نماز پڑھ کر دعا مانگی کہ اللہ! خدیجہ کو اس تکلیف سے نجات دے۔ واپس آکر چچی جان کے بڑے بھائی عامر عثمانی صاحب کو ٹیلیگرام کیا۔ شام کو چچی جان کو بہت تیز پھندا لگا اور سانس لینا بھی مشکل ہو گیا، تبھی ایک گانٹھ سی خون میں لت پت حلق سے باہر آئی اور مولانا بھی گھبرا گئے۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس چلنے کو کہا مگر تھوڑی دیر میں چچی جان کو سکون ہونے پر انھوں

نے کہا کہ کل آپریشن کے لئے جانا ہی ہے، اب میں ٹھیک ہوں۔ عامر عثمانی صاحب بھی رامپور پہنچ گئے۔ ڈاکٹر کے پاس پہنچنے پر ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا کہ انھیں تو اب ٹانسل ہیں ہی نہیں! شام کا واقعہ سن کر ڈاکٹر بھی حیرت میں پڑ گیا اور اس نے کہا کہ ایسا تو کبھی ہوتا ہی نہیں ہے! اس طرح چچی جان بغیر آپریشن کرائے خوشی خوشی گھر آگئیں اور سب نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

چچی جان کی بھتیجی سیما (جو ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں) کی طبیعت زیادہ خراب ہونے پر ان کے بھائی بہتر علاج کے لئے دیوبند لے گئے اور چچی جان اکیلی رہ گئیں۔ تحریک کے کارکن انھیں شمس نوید ہال میں رکھنا چاہتے تھے اور ایک خادمہ کو ساتھ رکھنے کی بھی تیاری تھی۔ طارق صاحب اور ان کی اہلیہ بھی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، لیکن خادمہ ہر وقت نہیں رہ سکتی تھی اور دیوبند وہ جانا نہیں چاہتی تھیں، چنانچہ انھوں نے میرے ساتھ رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ میرے لئے بے حد خوشی کی بات تھی، میں نے اپنے مکان میں ایک کمرہ چچی جان کے لئے آراستہ کر دیا اور طارق صاحب فرصت ملنے پر خود بھی آتے یا ڈاکٹر شمع طارق کو بھیجتے۔ مولانا محمد احمد صاحب کی اہلیہ اور بچے بھی خاص خیال رکھتے تھے۔

چچی جان اپنے انتقال سے قبل اکثر انہیں خواب میں دیکھا کرتی تھیں۔ کبھی دیکھتیں کہ وہ گلی میں ٹہل رہے ہیں، میرے آنے کے منتظر ہیں۔ کہا کرتی تھیں کہ شاید اب میرے جانے کا وقت آگیا ہے، وہ بار بار مجھے لینے آرہے ہیں۔ پھر

سب سے کہتیں کہ آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔ اکثر اجتماع ختم ہونے پر یہ دعا کرتیں کہ اللہ! جس طرح ہم سب لوگ تیرا ذکر کرنے کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں، ہم سب کو جنت میں بھی ایک ساتھ جمع کرنا!

آخری عمر میں سننے کی طاقت بالکل ختم ہوگئی تھی اور کاغذ پر لکھ کر بات ہوتی تھی۔ وہ فجر کی نماز کے بعد اکثر ایک آواز سنا کرتی تھیں۔ انھیں لگتا تھا کہ جیسے کوئی سورۂ رحمٰن زور زور سے پڑھ رہا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنی بھابھی کو میرے کمرے میں بھیج کر دکھواتی تھیں کہ پروین تو تلاوت نہیں کر رہی ہے؟ میں انھیں بتاتی کہ میں تلاوت نہیں کر رہی تھی۔ میں نے چچی جان سے پوچھا کہ آپ تو سن ہی نہیں سکتی ہیں، پھر تلاوت کی آواز کیسے آتی ہے؟ چچی جان نے جواب دیا کہ ہاں میری سماعت بالکل نہیں ہے لیکن میرا یقین کرو مجھے سورۂ رحمٰن کی آواز صاف آتی ہے! پتہ نہیں کون تلاوت کرتا ہے؟

اپنے انتقال سے چند روز قبل چچی جان، مشن کے ایک مخلص ساتھی شکیل بھائی کے گھر چلی گئی تھیں، جہاں وہ پہلے بھی کئی بار رہیں اور پورا خاندان ان سے بے حد محبت کرتا تھا اور خدمت بھی کرتا تھا۔ اس مرتبہ وہ ہم سب سے اس طرح مل رہی تھیں جیسے بہت لمبے سفر پر جارہی ہوں۔ مجھے عجیب سے خوف کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی خیال میں گم تھی کہ چچی جان نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا۔ ''پروین چلتے ہیں اپنا خیال رکھنا! پھر ملیں گے اگر خدا لایا!''۔ جانے کے بعد طبیعت

خراب ہوگئی اور فون پر خیریت ملتی رہی۔ جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک ایک خبر بجلی بن کر گری۔ ''چچی جان کا انتقال ہوگیا!''۔ میں سکتے میں آگئی اور میری بیٹی نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے تھوڑی آواز کے ساتھ کہا۔ 'انّا للہِ واِنّا الیہِ رَاجِعُون'۔ یہ الفاظ میں نے بھی دوہرائے۔

شہناز محبوب : وہ اپنے آپ میں خود ایک انجمن تھیں

میں چچی جان کو اسکول کے وقت سے جانتی تھی۔ مگر ہم صرف سلام کرکے ان سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل کیا کرتے تھے۔ اب سے تقریباً ۱۵ سال قبل میں ایک اجتماع میں جایا کرتی تھی جہاں چچی جان کے ساتھ زرینہ باجی اور زاہدہ باجی بھی ہوا کرتی تھیں۔ زرینہ باجی قرآن کی تشریح کرتیں اور چچی جان حدیث کا درس دیا کرتی تھی۔ پھر میں نے چچی جان سے باقاعدہ ملاقات کرکے پرانے گنج میں بھی اجتماع شروع کروایا جو کامیاب رہا۔ آج بھی جب ہم لوگ مل کر بیٹھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں۔ ان سے متعلق جتنی بھی خواتین تھیں، سب کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ان سے سب سے زیادہ محبت کرتی ہیں، ان کی شخصیت ہی ایسی تھی۔ جو ایک بار ان سے ملتا اس کو اپنا بنالیا کرتی تھیں۔

ان کی زندگی بہت سادہ تھی اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں، بے حد تواضع کرنے والی تھیں اور در حقیقت انھوں نے اپنی زندگی صحابیاتؓ کے نقشِ قدم پر

گزاری اور اسی لئے اللہ نے ان کا ذکر بلند کیا اور رامپور میں ان کے بیٹے، بہوئیں اور بیٹیاں سب موجود ہیں جو ان کے لئے دعائے خیر کرتے رہتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ پروردگار ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔۔۔ آمین!

☆☆☆

پردے کا سائنٹفک لباس

آج مغربی تہذیب کے شیطان نے پردے اور گھر کا خوب مذاق اڑایا ہے۔ اس کو قید خانے، قیدیوں کا لباس اور نہ جانے کیا کیا ٹھہرایا ہے۔ حالانکہ برقعہ اور پردہ عورت کا وہ سائنٹیفک لباس ہے جو اس کو بہت سے برے اثرات سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ سے باہر کی دنیا میں برے اثرات پھیلانے کی روک تھام کرتا ہے۔ اس طرح گھر قید خانہ نہیں، ایک محفوظ قلعہ ہے جس کے اندر عورت کو باہر کے برے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس کا بچہ حفاظت سے رہ سکے۔ برقعہ اس کے منفی اثرات سے دنیا کو بچاتا ہے، تو گھر کا کونہ اور گھر کی چہار دیواری خود اس کو دنیا کے زہریلے اثرات سے بچاتی ہے۔

شمس نوید

نذرانۂ خلوص

(ایک حقیر سا تحفہ جو اپنی بہن خالدہ تنویر کو ان کے اور اپنے بھیا سلیم کی شادی پر پیش کیا گیا۔)

خدیجہ نوید عثمانی ۲۹ ستمبر ۱۹۶۶

خوشی کی طلعت و تنویر کتنی روشن ہے!
دلِ سلیمؔ کی تقدیر کتنی روشن ہے!
خوشا! یہ جلوۂ سنّت تکلفات سے پاک
ہمارے خواب کی تعبیر کتنی روشن ہے!
خوشی بھی غم ہے اگر شکر کا سُرور نہ ہو
وہ دن بھی رات ہے جس میں یقیں کا نور نہ ہو
خوشی کا وقت ہے احساسِ شکر کا لمحہ
قریب ہو کے تو انساں خدا سے دور نہ ہو!
یہ ایک جشنِ خوشی نیک فال ہو یارب!!
درست امتِ عاصی کا حال ہو یارب!
یہی ہے نذرِ خدیجہ بس اک دعائے خلوص
اس ابتداء کا حسیں تر مآل ہو یارب

☆☆☆

بچوں کے دوست : شمس نوید عثمانی

(بچوں کے رسالے 'نور' کو دیا ہوا ایک انٹرویو)

محمود عالم

پیارے بچو! آؤ ہم تمہیں تمہارے ایک اچھے چچا میاں سے ملائیں۔

یہ ہیں جناب شمس نوید عثمانی صاحب، وہ رامپور کے ایک اسکول میں استاد ہیں۔ کہنے کو تو استاد ہیں لیکن حقیقت میں وہ بچوں کے دوست ہیں۔ ننھے منے بچوں سے لے کر بڑی عمر کے بچے سب ان کے دوست ہیں۔ وہ کہتے بھی یہی ہیں کہ "سب بچے میرے دوست ہیں۔"

تو بھئی، شمس صاحب ہم سب کے دوست ہیں۔ بچوں سے ان کی دوستی اور محبت کو دیکھ کر ہمارا جی چاہا کہ ہم تمہارے لئے ان سے ملاقات کریں۔

ایک دن شام کے وقت عصر کی نماز سے پہلے میں ان کے مکان پر پہونچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ کچھ چھوٹے چھوٹے بچے ان کے گھر میں کھیل رہے ہیں۔ شمس صاحب ،بچوں کو کھیل ہی کھیل میں کام کی باتیں بتاتے رہتے ہیں، اس لئے بچے ان سے بہت ہلے ملے رہتے ہیں۔

میں جیسے ہی ان کے مکان پر پہونچا، اور آواز دی، ایک چھوٹا بچہ نکل کر باہر آیا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

میں نے سلام کا جواب دے کر اس بچے سے پوچھا: "شمس صاحب اندر ہیں؟

"جی ہاں، فرمائیں کیا کام ہے؟" "مجھے ان سے ملنا ہے۔" میں نے لڑکے سے کہا اور وہ اندر چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد باہر آیا، "چلئے، وہ آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔"

میں اس بچے کے ساتھ مکان کے اندر پہونچا۔

ہاں بھئی تو مکان کے اندر پہنچنے کے بعد میں نے دیکھا وہاں کچھ اور بچے کھیل رہے ہیں۔ شمس صاحب سے سلام اور مصافحہ کے بعد میں نے انٹرویو لینا شروع کیا۔

بچے بہت سمجھدار تھے ہم لوگوں کو بات چیت کرتے ہوئے دیکھ کر وہ گھر میں دوسری طرف جاکر کھیلنے لگے۔

میں نے شمس صاحب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں کیا۔ بھئی قیامت کے دن اللہ میاں سب سے پہلے نماز ہی کے بارے میں تو پوچھیں گے اس لیے میں نے شمس صاحب سے بھی پہلا سوال نماز ہی کے بارے میں کیا۔

"شمس صاحب! جب آپ نے نماز پڑھنا شروع کی تھی اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟"

"جناب! میں بہت بچپن سے نماز پڑھتا ہوں، گھر کے لوگ کہتے ہیں کہ جب میں بہت چھوٹا سا تھا تو اتی اور دوسرے لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر نماز پڑھتا

تھا۔ بچپن کی نماز بھی کیسی نماز ہوتی ہے۔ جیسے جیسے بڑے کرتے تھے، میں بھی کرتا تھا۔"

میرے بچپن کی نماز کا ایک بہت دلچسپ واقعہ ہے، آپ بھی سنئے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں اپنے بڑے بھائی جان کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز پڑھنے کے درمیان مجھے بہت زور کا پیشاب لگا۔ میں نے سوچا نماز تو توڑی نہیں جاسکتی ہے اور ادھر پاجامہ خراب ہونے ہی والا ہے۔ کروں تو کیا کروں؟ چنانچہ ایسا ہوا کہ پاجامہ خراب ہو گیا۔ مگر میں نے نماز نہیں توڑی۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جانماز بھی خراب ہو گئی تھی، مگر میں اسی حالت میں نماز پڑھتا رہا۔ اور سب لوگ ہنستے رہے۔ بڑے بھائی جان نے کہا:

"ارے یہ کیا کیا؟"

"میں نے کہا، نماز کیسے توڑتا؟"

بھائی جان نے کہا "نماز تو ٹوٹ گئی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔۔۔ "کیسے ٹوٹ گئی میں نے تو توڑی نہیں۔"

بھائی جان بولے۔ "وہ تو اسی وقت ٹوٹ گئی تھی جب تم نے پیشاب کر دیا۔"

اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ نماز میں پاخانہ پیشاب کرنے، زور سے ہنسنے اور ہوا نکلنے سے وضو ٹوٹ جائے تو بغیر وضو کے نماز پڑھنے سے نماز نہیں ہوتی۔

پھر جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا مجھے نماز، وضو اور پاکی کے بارے میں دین کی باتیں معلوم ہوتی گئیں۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میں بہت چھوٹا سا تھا۔ کچھ کچھ تو مجھے یاد ہے اور کچھ دوسروں نے بتایا کہ ایسا ہوا تھا۔ تو جناب، اللہ کے فضل سے میں بچپن ہی سے نمازی ہوں۔"

شمس صاحب کے خاموش ہوتے ہی میں نے ان سے دوسرا سوال تعلیم کے بارے میں پوچھا،

"جناب! آپ نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی؟"

"میں نے ابتدائی تعلیم اپنی ماں کی گود میں حاصل کی" شمس صاحب کہنے لگے۔ "میرا سب سے پہلا مدرسہ امّی جان کی گود ہے۔ امی جان نے مجھے کلمہ پڑھنا سکھایا، قرآن پاک کی چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرائیں۔ نماز سکھائی اور بہت سی دین کی باتیں بتائیں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ امی جان رو رہی ہیں۔ میں نے گھبرا کر امّی جان سے پوچھا۔

"امّی جان! آپ رو رہی ہیں؟"

"ہاں بیٹا! مجھے اپنی امّی یاد آرہی ہیں۔"

"اچھا! امی جان آپ کی بھی امّی تھیں؟ آپ کو بھی اپنی ماں یاد آتی ہیں؟"

"ہاں بیٹا! سب کو اپنی ماں یاد آتی ہے۔"

"امّی جان! کہاں ہیں آپ کی ماں؟"

"بیٹا! وہ مر گئیں۔"

"کیا آپ بھی ایک دن مر جائیں گی امّی جان۔"

"ہاں میرے لال! سب کو ایک دن مرنا ہے۔"

یہ سننا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، امی جان مجھے روتا دیکھ کر چپ ہو گئیں اور مجھے چپ کرانے لگیں۔ بڑی مشکل سے میں نے رونا بند کیا۔ امی جان نے مجھے بتایا کہ مرنے کے بعد آدمی اللہ میاں کے پاس چلا جاتا ہے۔ نیک لوگ جنّت میں جاتے ہیں۔ اس لئے مرنے سے ڈرنا کیسا؟ مرنے کے بعد جنّت میں سب سے ملاقات ہو گی۔ جب تم ہمیشہ نیک کام کروگے تو اللہ میاں خوش ہوں گے اور تمہیں جنّت میں داخل کریں گے۔

اللہ نے چاہا تو مرنے کے بعد دوبارہ جنت میں ہم سب ایک ساتھ رہیں گے۔ امّی جان کے سمجھانے سے مجھے یقین آگیا کہ مرنے کے بعد پھر سب دوبارہ زندہ ہوں گے اور نیک لوگ جنّت میں رہیں گے۔

اسی دن سے میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہر آدمی کو ایک دن مرنا ہے۔"

شمس تنویر صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اب میں نے ان سے پوچھا،

"جناب شمس صاحب! جب آپ کی امّی جان کا انتقال ہوا تھا اس وقت آپ روئے بھی تھے!"

"جی ہاں! امّی جان کا جب انتقال ہوا تھا اس وقت میری عمر پندرہ برس کے قریب رہی ہو گی۔ امی جان کو قبر میں دفن کرنے کے بعد میں وہاں سے سیدھا مسجد آیا اور نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے خوب رورو کر دعا مانگی۔ میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا، امّی جان جب تک ہمارے پاس تھیں، ہم انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے

تھے۔ اب وہ اللہ میاں کے یہاں چلی گئی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو وہاں ان کو کوئی تکلیف پہونچے۔ اس لئے میں نے اللہ سے دعا کی۔ یا اللہ میری امی جان کو کوئی تکلیف نہ ہو، جس طرح آپ نے انہیں دنیا میں آرام و چین سے رکھا اسی طرح اپنے پاس بھی انہیں اس سے زیادہ آرام سے رکھیے، ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔"

بات چلی تھی ابتدائی تعلیم سے اور پہنچ گئی تھی کہاں۔ میں نے پھر ان سے انکی تعلیم کے بارے میں پوچھا۔

"جناب! آپ نے ابتدائی تعلیم توماں کی گود میں حاصل کی لیکن تعلیم مکمل کہاں کی؟"

"بھئی! میں نے تعلیم مکمل کہاں کی ہے؟ ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں، بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ اب میں نے اصل پڑھائی شروع کی ہے۔ بچوں کو پڑھانا حقیقت میں خود پڑھنا ہے، آدمی جب تک استاد اور ماں باپ کے دباؤ سے پڑھتا ہے اس وقت حقیقت میں وہ پڑھتا نہیں ہے۔ آدمی کی اصل تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ کسی دباؤ کے بغیر خود اپنے شوق سے پڑھتا ہے چونکہ مجھے اس زمانے میں خود سے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا ہے اس لیے میری تعلیم گویا اب شروع ہوئی ہے اور اللہ نے چاہا تو میں زندگی بھر تعلیم حاصل کرتا رہوں گا۔"

"شمس صاحب! مجھے آپ اپنی تعلیم کے بارے میں ایک بات بتایئے، کیا آپ بھی بچپن میں پڑھائی سے جی چُراتے تھے؟"

"جی ہاں! مجھے بچپن میں پڑھنے لکھنے کا بالکل شوق نہ تھا۔ میں ہمیشہ پڑھنے سے جی

چراتا تھا۔ مارے باندھے اسکول جاتا تھا۔ ایک دن میری بھابھی جان نے مجھے بہت سمجھایا، اگر تم پڑھو لکھو گے نہیں تو جاہل رہ جاؤ گے۔ ایک دن ماں باپ دونوں مر جائیں گے پھر تمہیں خود کما کر کھانا ہو گا۔ کمانے کے لئے پڑھنا لکھنا بہت ضروری ہے۔ آدمی یا تو کما کر کھا سکتا ہے، یا بھیک مانگ کر پیٹ پال سکتا ہے یا پھر چوری کر کے، بتاؤ تم کس چیز کو پسند کرتے ہو۔ بھیک مانگنا شرم کی بات ہے چوری کرنا گناہ اور شرم کی بات ہے، ہاں کما کر کھانا اچھی بات ہے، تم کیا چاہتے ہو؟۔"

بھابھی جان کے سمجھانے کا مجھ پر بہت اچھا اثر ہوا۔ میں نے سوچ لیا کہ مجھے خود کما کر حلال روزی کھانا ہے۔

اس دن سے میں شوق سے اسکول جانے لگا۔ پھر کچھ دن کے بعد پہلے ابا جان پھر امی جان کا انتقال ہو گیا۔ اب مجھے بھابھی جان کی وہ بات یاد آئی کہ ایک دن ماں باپ دونوں مر جائیں گے اور مجھے خود کما کر کھانا ہو گا۔ بس اسی دن سے میں خوب محنت سے پڑھنے لگا اور جب میں نے بی اے کا امتحان پاس کر لیا تو میں اسکول میں ٹیچر ہو گیا۔ اور آج اللہ کے فضل سے خود سے کما کر حلال روزی کھا رہا ہوں۔"

شمس صاحب کے چپ ہوتے ہی میں نے ان سے پوچھا، "اچھا ذرا یہ تو بتا دیجئے، آپ کو بچپن میں کن کن چیزوں سے دلچسپی تھی؟"

"بچپن میں مجھے جن چیزوں سے دلچسپی تھی ان میں ایک آسمان ہے۔ میں اکثر آسمان میں ستاروں کو دیکھتا تھا۔ نیلے آسمان میں چمکتے ستارے مجھے بہت اچھے لگتے

تھے۔ گرمی کی راتوں میں آنگن میں لیٹ کر میں بہت غور سے ستاروں کو دیکھا کرتا تھا۔ یہ ستارے جو دیکھنے میں چھوٹے لگتے ہیں اتنے بڑے ہوں گے کہ ہماری دنیا سے بھی بڑے ہوں، مجھے یہ بات بڑے ہونے کے بعد معلوم ہوئی اور جیسے جیسے میرا علم بڑھتا گیا، اللہ کی قدرت کو دیکھ کر میری حیرانی بڑھتی گئی۔ یہ ستارے بھی اللہ میاں کی بہت بڑی نشانی ہیں۔

بچپن میں مجھے پرچھائیں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ میں اکثر اپنی پرچھائی سے کھیلا کرتا تھا۔ کبھی پرچھائی کو مُکّا دکھاتا کبھی اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ پرچھائیں کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی۔"

شمس صاحب! کیا آپ کو بچپن میں کہانی پڑھنے کا شوق تھا؟"

"جی ہاں مجھے بچپن میں کہانی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک کہانی جس کا عنوان تھا "دو گز زمین" اس سے میں نے بہت اثر لیا تھا۔ کہانی یہ تھی:

ایک بادشاہ تھا اس نے ایک دن اپنی رعایا کو جمع کیا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ آدھے گھنٹے کے اندر جو آدمی دوڑ کر جتنی زمین کو گھیر لے گا وہ زمین اس کو دے دی جائے گی۔ بادشاہ کے پاس زمین کی کیا کمی تھی پورا ملک اسی کا تھا۔

خیر تو ہوا یہ کہ بہت سے لوگ زمین حاصل کرنے کے لالچ میں دوڑنے لگے۔ دوڑنے کا قاعدہ یہ تھا کہ بادشاہ کے پاس سے دوڑنا شروع کریں اور آدھے گھنٹے کے اندر دوڑ کر جتنا بڑا گھیر ابنا سکتے ہوں بنالیں۔ گھیر ابناتے ہوئے پھر بادشاہ کے پاس آجائیں۔ جو جتنا بڑا گھیر ابناتا اس کو اتنی ہی زمین ملتی۔

ہاں تو اس اعلان کے سنتے ہی سب لوگ جو وہاں پر تھے دوڑنے لگے۔ ایک آدمی نے دوڑنا شروع کیا، وہ بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ وہ سب سے آگے نکل گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ زمین گھیرنا چاہتا تھا۔ اس لیے بہت تیز دوڑ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر دو میل کے قریب دوڑ کر چلا گیا، لیکن اسے واپس آکر گھیرا پورا کرنا تھا۔ یعنی دوسری طرف سے گھوم کر وہاں پہنچنا تھا جہاں سے وہ چلا تھا۔ کچھ دور تک تو وہ سیدھا دوڑتا رہا تھا پھر دائیں طرف مڑ کر دوڑنے لگا۔ کچھ دور جا کر وہ پھر دائیں طرف مڑا۔ اب صرف دس منٹ باقی تھے۔ لیکن اسے ابھی ایک دو میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اسے وقت ختم ہونے سے پہلے وہاں پہونچنا تھا جہاں سے وہ چلا تھا وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس نے اور تیز دوڑنا شروع کیا۔ خوب تیز گھوڑے سے بھی زیادہ۔ جیسے جیسے وقت ختم ہو رہا تھا اس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔

دوڑتے دوڑتے آخر وہ بہت قریب پہنچ گیا۔ اب اُسے صرف چار گز کا فاصلہ طے کرنا باقی رہ گیا تھا۔ وقت پورا ہونے میں ابھی آدھا منٹ باقی تھا۔ اور اسے صرف چار گز کا فاصلہ طے کرنا تھا، وہ تھک کر چور ہو گیا تھا، سانس پھول چکی تھی۔ پاؤں جواب دے چکے تھے، لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور خوب طاقت سے دوڑا، چوتھا گز، تیسرا گز، اب صرف دو گز زمین دوڑنے کو رہ گئی تھی۔ اس کے بعد زمین کے بہت بڑے رقبہ کا مالک ہو جائے گا۔ خوشی سے وہ پھولا نہ سما رہا ہو گا اچانک اس وقت اس کے ٹھوکر لگی۔ ٹھوکر کھا کر وہ زمین پر گرا اور اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ مرنے کے بعد اُسے اسی دو گز زمین میں دفن کر دیا گیا، اس طرح اسے

صرف دو گز زمین ملی۔

انسان اپنی زندگی میں زمین حاصل کرنے کے لئے کتنی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کی دولت کے پیچھے کتنی دوڑ لگاتا ہے۔ لیکن آخر میں اسے ملتی ہے دو گز زمین یعنی قبر۔ مجھے یہ کہانی بہت اچھی لگی تھی کیوں کہ اس میں بہت بڑا سبق ہے۔"

شمسؔ صاحب یہ کہانی سنانے کے بعد چپ ہو گئے۔ اور میں نے ان سے پوچھا۔ "جناب! یہ تو معلوم ہو گیا کہ نماز کا شوق آپ کو بچپن سے تھا۔ اور والدین اور دوسرے بزرگوں کے ذریعہ آپ دین کی بہت سی باتیں جان چکے تھے، لیکن صحیح معنی میں آپ کے اندر دین کی سمجھ اور اللہ کا ڈر کیسے پیدا ہوا؟"

شمسؔ صاحب نے جواب دیا:

"دین کی باتیں کچھ تو میں بچپن ہی سے جانتا تھا، لیکن دین کی سمجھ جس چیز سے پیدا ہوئی وہ جماعت اسلامی ہند کی کتابیں ہیں۔ جماعت اسلامی کی کتابیں پڑھنے کے بعد میں نے دین اسلام کو اچھی طرح جانا اور اسی کے بعد اسلام میں میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد میرے بھائی جناب عامر عثمانی صاحب نے مجھ سے صحابہ کرامؓ کی سیرت پر کچھ لکھنے کے لئے کہا اور اس خیال سے جب میں نے صحابہ کرامؓ کے بارے میں پڑھنا شروع کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ سچّے مسلمان کیسے ہوتے ہیں؟ ایک مسلمان کو کیسا ہونا چاہئے؟ صحابہ کرامؓ کی زندگی کے حالات پڑھنے کے بعد میں خود کو ان کی طرح بنانے کی کوشش کرنے لگا۔ صحابہ کرامؓ کی زندگی ہمارے لیے بہت اچھا نمونہ ہے۔ ویسے تو میرے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف

تھا، لیکن ایک مرتبہ ایک لاش کو دیکھ کر اور زیادہ ہو گیا۔ جب میں لکھنؤ میں تھا تو وہاں میں نے ایک لاش کو دیکھا۔ لاش سڑ چکی تھی، اس میں کیڑے پڑ چکے تھے۔ ایک انسانی لاش کو دیکھ کر مجھ پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اللہ کا خوف دل میں سما گیا۔ موت کی یاد انسان کے دل میں اللہ کا خوف بھر دیتی ہے۔"

شمس صاحب کے چپ ہوتے ہی میں نے ان سے ایک بہت دلچسپ سوال کیا۔

"جناب! بچے تو معصوم ہوتے ہیں۔ اللہ میاں بچوں کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ سنا ہے آخرت میں بچپن کی غلطی پر کوئی پکڑ نہ ہو گی۔ پھر جب بچے شرارت کرتے ہیں تو بڑے انہیں کیوں سزا دیتے ہیں؟ جب آخرت میں بچپن کی غلطی پر کوئی پکڑ نہ ہو گی تو پھر بچے کیوں نہ خوب دل کھول کر شرارت کریں جبکہ شرارت کرنے میں انہیں مزا بھی آتا ہے۔؟"

شمس صاحب میرے اس عجیب سوال پر مسکرائے پھر بولے:

"ہاں بھائی! بچپن کی شرارت پر اللہ میاں کے یہاں بچوں کی پکڑ نہیں ہوتی ہے، لیکن اس پر ان کے بڑوں کو ضرور سزا ملے گی کہ انھوں نے ان کو شرارت کرنے سے منع کیوں نہیں کیا۔ اب اگر جو بچہ یہ چاہتا ہو کہ اس کے ماں باپ کو اللہ میاں کے یہاں سزا ملے تو اسے خوب شرارت کرنا چاہئے۔ لیکن اگر وہ اپنے ماں باپ کو سزا سے بچانا چاہتا ہو تو شرارت بالکل نہیں کرنا چاہئے۔ ہمیشہ اچھے اچھے کام کرنا چاہئیں۔"

عصر کا وقت ہونے والا تھا اور انٹرویو کا وقت بھی ختم ہو رہا تھا اس لئے میں نے ان

سے آخری بات کہی:

"جناب! آپ نوری بچوں کو کچھ مشورے دیجئے۔"

شمسؔ صاحب نے کہا:

"نوری بچوں کو میرا مشورہ یہی ہے کہ وہ خوب کھیلیں۔"

"کیا فرمایا، خوب کھیلیں؟" میں نے تعجب سے پوچھا، اور شمس صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

"جی ہاں، خوب کھیلیں، لیکن ایسے کھیل جو مہذب ہوں، جن سے عقل اور چستی پیدا ہو۔ نوری بچوں کو ایسے کھیل ضرور کھیلنا چاہئے لیکن حد سے زیادہ نہیں۔ حد سے زیادہ ہر چیز بری ہوتی ہے اور کھیلنے کا حق صرف ان بچّوں کو ہے جو دل لگا کر پڑھتے ہیں، ماں باپ اور استاد کا کہا مانتے ہیں بس ایسے ہی بچوں کو کھیلنے کا حق ہے۔"

عصر کی اذان ہونے ہی والی تھی اور انٹرویو بھی ختم ہو گیا تھا کہ شمسؔ صاحب نے کہا:

"نوری بچوں سے میری ایک درخواست ہے، وہ یہ ہے کہ نوری بچے مجھے اپنا دوست بنالیں میرے پاس خط لکھیں۔ میں اللہ نے چاہا تو خط کے ذریعہ ان کو بہت سی اچھی باتیں بتاؤں گا، اور کبھی کبھی میں خط کے جواب 'نور' کے ذریعہ دوں گا۔ میری خواہش ہے کہ نوری بچے مجھ سے دوستی بڑھائیں اور خط و کتابت کریں۔"

"انشاء اللہ میں آپ کا پیغام نوری بچوں تک پہونچادوں گا۔"

عصر کی نماز کے لئے اذان ہوئی اور میں نے وضو کیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو شمس نوید صاحب کے یہاں کھیل رہے تھے انھوں نے بھی وضو کیا اور ہم سب نماز پڑھنے کے لیے مسجد پہونچے۔ ہم نے نماز پڑھی، بچوں نے بھی نماز پڑھی۔ وہ بچے شمس صاحب کے دوست تھے۔ نماز میں انھوں نے کوئی شرارت نہیں کی، بالکل خاموشی سے نماز پڑھی۔

نماز کے بعد جب ہم مسجد سے نکل کر بازار کی طرفِ چلے تو ہم دونوں کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ بچہ آخر بچہ ہی ہوتا ہے، اس نے سڑک سے کچھ کنکریاں اٹھائیں اور اِدھر اُدھر دیوار پر پھینکنے لگا۔ شمس صاحب نے اس بچے سے کہا:

"بھئی میں آپ کو اس سے بھی اچھا ایک کام بتاؤں۔ آپ دیواروں کو کنکری مارنے کے بجائے، شیطان کو بڑے بڑے پتھر ماریئے۔"

لڑکے نے پوچھا "بھلا شیطان کو کیسے پتھر مارا جا سکتا ہے؟"

"وہ اس طرح"--- شمس صاحب نے لڑکے کو اُنگلی پر بتاتے ہوئے کہا- "آپ اس طرح انگلی پر ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہتے ہوئے چلئے، آپ جتنی بار اللہ کا نام لیں گے اتنی ہی مرتبہ شیطان کو پتھر کی چوٹ لگے گی۔"

میں نے دیکھا کہ وہ بچہ اس وقت سے ایسا ہی کرنے لگا۔ ہم دونوں راستے میں باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے اور شمس صاحب کا ننھا منا دوست شیطان کو پتھر مارتا ہوا چل رہا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ راستہ میں ایک شیشے کا بڑا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ میرا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ اسے راستے سے ہٹا کر پھینک دوں۔ لیکن اس بچے کی نظر اس پر گئی اور اس نے اسے اٹھا کر ایک طرف سڑک کے کنارے پھینک دیا۔ "جزاک اللہ، اللہ تمہیں اچھا بدلہ دے۔" میرے دل سے دعا نکلی۔ بچے کے اندر اس خوبی کو دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا، لیکن تعجب کی بات ہی کیا ہے۔ شمس صاحب کے سارے ننھے منے دوست ایسے ہی ہیں۔

نوری بچو! تم ضرور شمس صاحب سے دوستی کرو اور ان کو خط لکھو، وہ تمہیں بھی اچھی اچھی باتیں بتائیں گے۔

(بشکریہ بچوں کا رسالہ، ماہنامہ نور، جون ۱۹۷۱ء)

☆☆☆

سنگم پر تیرتھ

"آ اِک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں۔" جب ولی اللہ علامہ ڈاکٹر اقبال نے یہ کہا تھا تو لوگ ان کی بات سمجھ نہیں سکے تھے۔ ایسی ہی ایک بات حضرت شمسؒ فرمایا کرتے تھے، "ہندو نے سدا سنگم پر تیرتھ بنایا ہے۔ وید اور قرآن روپی گیان گنگاؤں پر جو تیرتھ بنے گا وہ مہانتم (اعلیٰ ترین) ہوگا۔" اس وقت لوگ اسے بھی نہیں سمجھ سکے۔ حضرتؒ کا مفہوم یہ تھا جسے انہوں نے بعض دوسرے مواقع پر بیان کیا کہ ہندوستانی قوم وید کے علم کی روشنی میں قرآن تک پہنچے گی، اور ایک حدیث کے مطابق اس طرح ایمان میں آنے والوں کا ایمان حیرت انگیز اور انتہائی اعلیٰ درجہ کا ہوگا۔ (سیّد عبداللہ طارق)

ایسے تھے ہمارے پھوپھا جان!

خولہ عثمانی

جس طرح تاریکیوں کے اندھیرے کتنے ہی گہرے ہوں، ایک چراغ ان کو مٹانے کے لئے کافی ہوتا ہے، ٹھیک اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ اس روئے زمین پر کچھ خاص بندوں سے اس چراغ کا کام لے لیتا ہے اور یہ لوگ سماج کو گمراہیوں سے نکال کر صراطِ مستقیم پر چلانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کردار ہیں 'شمس نوید عثمانیؒ' جن کی عاجزی، انکساری، صبر و تحمل، کردار اور خلوص کتنے ہی لوگوں کے لیے اللہ کو پہچاننے اور اس سے قربت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا۔

محترم شمس نوید عثمانیؒ میرے پھوپھا تھے اور ان کی شریک حیات میری پھوپھی تھیں جنہیں میں اَپّی کہا کرتی تھی۔ خاندان کے بہت سے چھوٹے بڑے انہیں اَپّی کہتے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ میں نے زندگی کے بہت بیش قیمت لمحات گزارے ہیں۔ میرا رشتہ بھی پھوپھا جان کے ذریعہ ہی ہوا تھا۔ پھوپھا جان کی زندگی کا ہر لمحہ دین کے لئے وقف تھا اور اللہ سے محبت کی طرف لے جاتا تھا۔ اس کی کچھ جھلکیاں پیش خدمت ہیں:

- اپنے ہر ضروری کام کے لئے چچا پھوپھا جان قرآن سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

اپنے انتقال سے قبل جب ان کا سفر کا ارادہ تھا تو مجھ سے بولے کہ آج پتہ نہیں کیوں اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں مل رہا ہے اور اسی رات وہ وفات پا گئے۔

- پھوپھا جان جس شخص سے بھی ملتے تھے، چاہے بڑا ہو یا چھوٹا، مزدور ہو یا کوڑا اُٹھانے والا۔ اس سے دعائے مغفرت کے لئے ہاتھ پکڑ کر درخواست کرتے تھے اور اتنی عظیم شخصیت ہونے کے باوجود خود کو کم تر سمجھتے تھے۔
- گھر میں کوڑا اٹھانے کے لئے جو مہترانی آتی تھی اور جس کو لوگ گھر میں بلانا بھی پسند نہیں کرتے تھے، پھوپھا جان اسے بہن کہہ کر بلاتے تھے اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ اگر کوئی پھل مہمانوں سے نہیں بچتا تھا تو اس کے چھلکے تھیلی میں باندھ کر باہر پھینک کر آتے تھے تاکہ اس کی نظر نہ پڑے اور اپنے غریب اور نادار ہونے کا دل میں ملال نہ ہو۔
- ایک دن گھر کا پائپ خراب ہو گیا اور لیکیج کی وجہ سے سڑک پر پانی اکٹھا ہو گیا، تو چچا میاں پوری رات لالٹین لے کر راستہ پر کھڑے رہے تاکہ راہ گیروں کو تکلیف نہ ہو۔
- رات میں عشاء کی نماز کے بعد وہ کسی سے کوئی غیر ضروری بات نہیں کرتے تھے اور اپنے مالک کی یاد میں کھو جاتے تھے۔
- انھوں نے کبھی کسی شخص کی بُرائی نہیں کی اور نہ غیبت سننا گوارا کیا۔ وہ کہتے تھے کہ سب سے گنہ گار اور بُرا میں ہوں۔

☆☆☆

متفرقات

کھوٹے سکے اور دھوکے

اسلم شاہ خاں (سنبھل)

میں ایک بار اپنی بہن کے گھر رام پور آیا ہوا تھا۔ مولانا کی مشہور زمانہ کتاب کا مطالعہ میں پہلے ہی کر چکا تھا اور ان سے ملاقات کرنے کی میری شدید خواہش تھی۔ میں اپنے بھانجے کی مدد سے ان کے خستہ حال مکان تک جا پہنچا۔ دروازے پر دستک دینا چاہی تو مجھے اندر سے کچھ ٹھوکنے کی آواز آئی، میں نے دوبارہ تب تک دستک نہ دی جب تک کہ ٹھوکنے کی آواز بند نہ ہوگئی۔

دوسری دستک پر مولانا نے مجھے اندر بلالیا اور میں نے ان سے بہت سی باتیں کیں اور اسی درمیان میں نے مولانا سے سوال کیا کہ آپ کیا ٹھوک رہے تھے؟ انھوں نے مجھے روکا اور اندر جاکر ایک کھوٹا سکّہ لے کر آئے جسے ٹھوک کر تقریباً بے کار کر دیا گیا تھا۔ وجہ دریافت کرنے پر فرمایا کہ میں اس سکّہ کو ختم کر رہا تھا تاکہ جیسا دھوکہ اس سکہ سے میں نے کھایا ہے، کوئی دوسرا نہ کھا سکے! انھوں نے مجھے

سمجھایا کہ سماج کی جن چیزوں سے لوگوں کو دھوکہ پہنچنے کا اندیشہ ہو، انھیں روکنے کی کوشش کرنا چاہئے۔

ایک درد مند درویش

اختر حسین خاں (مولیناؒ کے پرانے واقف کار)

میری نظر میں وہ ایک 'درد مند درویش' تھے جو پوری انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتے تھے۔ میرا اُن سے قلبی رشتہ تھا، میں ان کی دینی مجلسوں میں شریک ہوا کرتا تھا اور میں نے اُن سے جو باتیں سنی تھیں وہ آج ہو بہو ہمارے سامنے واقعات کی شکل میں پیش آرہی ہیں۔ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی پکڑ اور ناراضگی سے بچنے کے لئے بس ایک ہی راستہ ہے کہ ان بندوں تک اس کا پیغام پہنچادیں جو اس سے محروم ہیں۔

ایک مرتبہ میں ان کے لئے تحفہ کے طور پر ایک گھر کی بنی ہوئی گُڑ کی بھیلی لے گیا۔ جب میں نے وہ بھیلی پیش کی تو بہت محبت سے کہا: آپ لے آئے ہیں تو میں اس تحفہ کو قبول کرتا ہوں، لیکن آئندہ جب بھی آپ کا ارادہ ہو تو مجھے بتادیں، میں آپ کو پہنچانے کی صحیح جگہ بتادوں گا۔ کیونکہ اس کے اندر جو چپک ہے وہ چپکا لے گی۔

☆☆☆

حضرت شمسؒ کا پیغام تحریک کے نوجوانوں کے نام

تصوّر و قلم ــــ مدثّر علی خاں

اے میرے بچو! تمہارے کاندھوں پہ ذمہ داری بہت بڑی ہے
ہے تنگ دامن، بلند منزل یہ آزمائش بہت کڑی ہے

جو ایک سپنا نبی نے دیکھا تمام عمر میں نے وہ جیا ہے
تمہیں پتا ہے کہ اپنی خاطر نہ کچھ تھا چاہا نہ کچھ کیا ہے
جو میرے علم و عمل کا حاصل تھا میرے بچو تمہیں دیا ہے

رسول کے تم رسول بننا کہ یہ سعادت بہت بڑی ہے
اے میرے بچو! تمہارے کاندھوں پہ ذمہ داری بہت بڑی ہے

تمہاری تعداد بھیڑیوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے
اور آستینوں میں سانپ بھی ہیں نہ اِس کا ڈر تھا نہ اِس کا غم ہے
ازل کا قولِ بلیٰ تمہیں یاد ہے تو منزل بھی ہم-قدم ہے

زمیں تمہاری فلک تمہارا، نہیں بہت وقت ــ کچھ گھڑی ہے
اے میرے بچو! تمہارے کاندھوں پہ ذمہ داری بہت بڑی ہے

تمہاری پیہم سعی کے صدقے بہت سے آئیں گے آنے والے
یہ سنتِ سابقہ ہے کچھ تو ضرور جائیں گے جانے والے
تم اپنی منزل کی فکر رکھنا نبھائیں گے بس نبھانے والے

ظہورِ نصرت کا وہ نشاں ہے جو سامنے مشکل آکھڑی ہے
اے میرے بچو! تمہارے کاندھوں پہ ذمہ داری بہت بڑی ہے

دیارِ ہندوستاں میں ہوگا ہر ایک لب پر یہی ترانہ
کہ مٹھی بھر ہی تھے وہ دِوانے ہوئے تھے صحرا کو جو روانہ
یہیں سے اٹھا تھا لا الہٰ سنے گا اب جس کو یہ زمانہ
یہ خواب پورا ضرور ہوگا یقیں کی طاقت بہت بڑی ہے
اے میرے بچو! تمہارے کاندھوں پہ ذمہ داری بہت بڑی ہے

تمہارے بیچ اب نہیں ہوں میں پر مجھے خبر ساری مل رہی ہے
تمہاری کوشش سے اس چمن کی کلی کلی خوب کھل رہی ہے
بہت ہراساں ہے کفر اب تو کہ اس کی بنیاد ہل رہی ہے
ذرا سی کوشش کرو تو باطل کی ہر عمارت گری پڑی ہے
اے میرے بچو! تمہارے کاندھوں پہ ذمہ داری بہت بڑی ہے

یہ میرا وعدہ ہے اُس جہاں میں مَیں تم سے دوری نہیں سہوں گا
میں روزِ محشر کو اپنے رب سے تمہاری نسبت یہی کہوں گا
یہ ساتھ جنت میں سب چلیں گے اکیلا ہرگز نہیں رہوں گا●
عطا وہ کیجے جو میں نے مانگا ہے گر شفاعت کی یہ گھڑی ہے
اے میرے بچو! تمہارے کاندھوں پہ ذمہ داری بہت بڑی ہے

● میں اس نئی نسل کا نمائندہ ہوں جنہیں حضرتؒ سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن ان کے صحبت یافتہ تقریباً سبھی تحریکی بھائیوں کے بقول، وہ بارہا کہا کرتے تھے کہ تم میں سے کوئی بھی چھوٹ گیا تو میرا جنت میں بھی دل نہیں لگے گا۔ (مدثر علی خاں)

☆☆☆

اسی کتاب سے۔۔۔

ایک مرتبہ چچی جان (مولاناؒ کی اہلیہ) دیوبند گئی ہوئی تھیں، چچا میاں (مولانا شمس نوید عثمانیؒ) اکیلے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں پہنچا تو دیکھا کہ گلاس میں پانی ہے اور روٹی کے سوکھے ٹکڑے جو چٹ چٹ کی آواز سے ٹوٹ رہے تھے، گلاس میں ڈبو ڈبو کر کھا رہے ہیں۔ میں نے کہا "یہ کیا؟ آپ میرے گھر کیوں نہیں آگئے؟" بغیر کسی تصنع کے خوش دلی سے فرمایا "یہ اللہ کا دیا ہوا رزق ہے اور بے حد لذیذ ہے۔ لو تم بھی کھاؤ۔" ان کی فرمائش پر دل کڑا کر کے میں نے ایک ٹکڑا توڑ تو لیا لیکن میرا ایمان ایسا مضبوط نہ تھا کہ مجھے وہ لذیذ لگتا! میری آنکھوں میں یہ دیکھ کر آنسو آگئے کہ چچا میاں واقعی بہت خوش ہو کر کھا رہے تھے۔

9 788193 283851